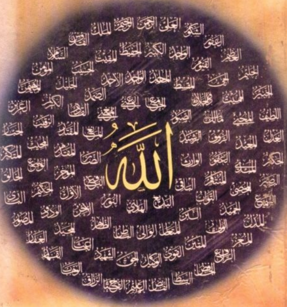
شرح اسماء اللہ الحسنیٰ



تصنیف

عارف کامل حضرت مولانا صغر علی روحی

خواص و اسرار

مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

اس لئے یہ اسم اس ذات پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ اسم تالہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنے تعبد کے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب اپنے بتوں کو الھۃ بولا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی پرستش کیا کرتے اور انہیں اپنا معبود جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ذات باری منعم حقیقی ہونے کی وجہ سے مستحق عبادت ہے۔ اس لئے وہ معبود ہے پس الہ بمعنی معبود ہوا۔ امام غزالی مقصد اسنیٰ میں لکھتے ہیں کہ اسم اللہ کے متعلق جس قدر اشتقاق کئے گئے ہیں محض تکلفات ہیں۔

(د) اس امر کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اللہ کو عموماً دعا کے موقع پر اللھم سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ خلیل ابن احمد اور سیبویہ کا مذہب ہے اللھم اصل میں یا اللہ تھا اور میم مشدد اخیر میں حرف ندا کا قائم مقام ہے مگر فرا نحوی کا مذہب ہے کہ اللھم اصل میں یا اللہ امنا بخیر ہے۔ حرف ندا اور صیغہ ام کا (صیغہ امر مشتق از ام یوم بمعنی قصد کردن) ہمزہ ساقط کرنے کے بعد اللھم ہو گیا۔ جیسے ھلم اصل میں ھل ام لھا تھا حذف ہمزہ پر ھلم ہو گیا۔ امام رازی اسی کو اقرب الی الصواب لکھتے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہر دو مذہب کے متعلق مخالف و موافق دلائل ہیں ہم نے عمداً ان سے اعراض کرنا مناسب سمجھا ہے۔ ہماری کتاب کا موضوع تحقیق لغوی نہیں الا اس حد تک کہ مقتضائے مبحث سے خارج نہ ہو۔

(ہ) مسائل متعلقہ جملہ لا الہ الا اللہ کی تحقیق

مسئلہ

اکثر اہل نحو کا مذہب ہے کہ اس جملہ میں حذف و اضمار ہے۔ چنانچہ اس کی توجیہ دو طرح پر کیا کرتے ہیں۔

(ا) اصل میں لا الہ لنا الا اللہ تھا۔

(ب) اصل میں لا الہ فی الوجود الا اللہ تھا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر دو توجیہ محل نظر ہیں۔ کیونکہ پہلی توجیہ کی رو سے اگر گروہ عباد کے الہٰ ثانی کی نفی ہوتی۔ تو یہ کہاں ثابت ہوا کہ دیگر مخلوقات کے لئے بھی ایک الہ ہے اس صورت میں توحید خالص معدوم ہو جائے گی۔ دیکھو قرآن مجید میں جملہ الھکم الہ واحد کے بعد لا الہ الا ھو کا ذکر اسی لئے ہوا ہے کہ پہلے جملہ سے صرف گروہ عباد کے الہ ثانی کی نفی ہوتی تھی۔ نہ دیگر مخلوقات کے الہ ثانی کی اس ظن کے دور کرنے کی خاطر بعد میں جملہ لا الہ الا اللہ کا ذکر فرمایا۔ جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ تمام موجودات کا الہ ایک ہی ہے۔ اور دوسری توجیہ کے مطابق لازم آئے گا کہ الہ ثانی کے وجود کی نفی ہو۔ نہ ماہیت و حقیقت الہ ثانی کی جو اس جملہ کا ظاہر مفہوم ہے اور یہ مسلم ہے کہ اخلاص توحید کے مقام میں نفی ماہیت اولے اور اقوی ہے۔ بہ نسبت نفی وجود کے پس جملہ لا الہ الا اللہ کو ظاہر پر ہی چھوڑنا صحیح ہے۔ حذف و اضمار کی کچھ ضرورت نہیں۔

مسئلہ

[illegible] میں نحاۃ نے لفظ الا کو غیر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور لا الہ الا اللہ [illegible] الہ غیر اللہ کی صورت میں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کے [illegible] شعر میں ہے

وکل اخ مفارقہ اخوہ   لعمر ابیک الاالفر قدان

(ہر ایک دوست اپنے دوست کو چھوڑ جایا کرتا ہے سوائے فرقدان کے [illegible])

یہاں الاالفرقدان بمعنی غیر الفرقدین ہے اور یہی خیال صحیح ہے۔ جملہ لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا میں کیونکہ یہاں بھی الا بمعنی غیر کے مستعمل ہوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ہم الا بمعنی غیر نہ سمجھیں بلکہ اس کو استثنیٰ کے معنے میں لیں تو جملہ لا الہ الا اللہ کا مطلب یہ ہوگا لا الہ

یستثنی عنھم اللہ یعنی ایسے معبودوں کی نفی ہو گی۔ جن سے اللہ مستثنیٰ ہے نہ ایسے معبودوں کی جس سے اللہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔ بلکہ ایسے معبودوں کے وجود کا اثبات لازم آئے گا جن سے اللہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ صریح کفر ہے۔ پس صحیح طور پر ثابت ہو گیا کہ حرف الا یہاں استثناء کے معنی میں مستعمل نہیں ہے ورنہ اخلاص توحید باطل ہو جائے گا۔

یہاں اس نکتہ کا بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ مسلّم ہے کہ کسی چیز کے اثبات کا تصور اس کی نفی کے تصور پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ مگر جملہ لا الہ الا اللّٰہ میں نفی کو اثبات پر مقدم رکھا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیم نفی میں کئی ایک اغراض ملحوظ ہیں۔ اول یہ کہ نفی الوہیت غیر اللہ کرنے کے بعد اثبات الوہیت ذات باری کے لئے کرنا زیادہ موکد سمجھا گیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ اگر ہم یوں کہیں لیس فی البلد عالم غیر زید (شہر میں زید کے سوا کوئی عالم نہیں) تو یہ جملہ زید عالم فی البلد کی نسبت زید کے عالم ہونے کو زیادہ موکدانہ طور پر ثابت کرتا ہے۔ دوم چونکہ ایک وقت میں قلب ایک ہی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اور جب ایک امر کی طرف توجہ کرے گا تو دوسرے امر کی طرف سے محروم رہ جائے گا۔ اس لئے جملہ لا الہ الا اللّٰہ میں جب لا الہ کہا جاتا ہے تو تمام ماسوی اللہ کی نفی ہو کر قلب خالی ہو جاتا ہے اور جب الا اللّٰہ کہا جاتا ہے تو انوار توحید کا محل ہو جاتا ہے اور قلب کو کسی امر غیر کی طرف کچھ لگاؤ نہیں رہتا۔ لہذا نفی کا مقدم کرنا اخلاص توحید کے لئے اہم ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے نماز سے پہلے وضو شرط ہے۔ کیونکہ طہارت کے بعد نماز کا ادا کرنا مقصد نماز کے لئے زیادہ موجب تکمیل ہے۔ اسی طرح لا الہ بھی قلب کو تعلق ماسوی اللہ سے بالکل پاک کر دیتا ہے۔ یا یوں کہو کہ جس طرح قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے استعاذہ (اعوذ پڑھنا) وساوس شیطانیہ سے موجب امن ہوتا ہے اس طرح جملہ لا الہ الا اللّٰہ میں نفی کا اثبات توحید پر مقدم لانا ضروری ہے۔ سوم یہ ضروری ہے کہ جو شخص

کسی جلیل القدر بادشاہ کو کسی مکان میں لانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس مکان کو ہر ایک قسم کی نجاسات سے پاک و صاف بنائے۔ تب بادشاہ کو اس مکان میں نازل ہونے کی تکلیف دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق نے کہا ہے کہ جملہ لا الہ الا اللّٰہ کا نصف اول بمنزلہ تنظیف کے لئے ہے۔ یعنی قلب کو پاکیزہ کرنا اور نصف ثانی بمنزلہ جلاء انوار کے ہے۔ یعنی انوار توحید سے قلب کو مزین کرنا۔ یا یوں کہو کہ نصف اول اشارہ ہے طرف فناء کی اور نصف ثانی اشارہ ہے۔ طرف بقاء کی۔

مسئلہ

جملہ لا الہ الا اللّٰہ کے متعلق یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو بذریعہ استدلال صحیح اس امر کا یقین ہو جاوے کہ عالم کائنات کے لئے ایک صانع حکیم کا وجود ضروری ہے تو اس علم یقینی کے بعد اس کو اس امر کا علم کیا مفید ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی دوسرا شریک یا اس کا مثل موجود نہیں کیونکہ یہ امر فی حد ذاتہ ذات باری کے لئے موجب کمال نہیں ہو سکتا۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ صرف ذات باری کے صانع عالم اور حکیم کامل ہونے پر ایمان لانا حصول سعادت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ایمان کے ساتھ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ اس کا کوئی مثل یا شریک موجود نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مثل یا شریک کی نفی پر ایمان نہیں ہو گا تو عبد کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہ صرف کسی ایک ہی کا عبد ہے۔ یا دو کا۔ اس صورت میں اس کا شکر و طاعت بجا لانا کس کے لئے ہو گا؟ اور اس کو کیسے یقین ہو گا کہ وہ صرف ایک ہی کا محتاج ہے۔ کیونکہ اس کو اس خیال کا موقع ہو گا کہ اگر ایک میرے اعمال کو قبول نہیں کرے گا تو دوسرا سہی لیکن نفی شریک و مثل پر ایمان لانے کی صورت میں اس کو یقین ہو گا کہ عالم کا معبود صرف ایک ہی ہے۔ تب وہ کامل اخلاص کے ساتھ حق عبودیت کو ادا کرے گا۔ اور صرف اسی

کا ہو کر رہے گا۔

مسئلہ

اس مقام پر اس مسئلہ سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ کہ گر کوئی شخص بذریعہ استدلال صحیح حقیقت توحید پر ایمان لے آئے مگر اسے اتنا وقت نہیں ملا کہ جملہ لا الہ الا اللہ کو زبان پر لائے۔ اور مر جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ صاحب ایمان ہو کر مرے گا۔ کیونکہ اس نے حق واجب کو ادا کر دیا۔ مگر اقرار زبانی کی مہلت نہ پا سکا۔ لیکن ایمان لے آنے پر اگر اسے مہلت اقرار زبانی کی مل گئی تھی مگر اس نے زبان سے اقرار نہیں کیا اور مر گیا تو ایسے شخص کی نسبت بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ صاحب ایمان نہیں اور بعض کا مذہب ہے کہ وہ صاحب ایمان ہے۔ مگر فاسق ہے۔ دلائل کی تفصیل اپنے موقع پر مذکور ہے۔

مسئلہ

اس امر کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ آیا کلمہ لا الہ الا اللہ زبان پر لاتے وقت حرف نفی یعنی لا کو مد صوت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ یا بلا مد صوت بعض علماء کا خیال ہے کہ مد صوت اولی ہے کیونکہ اثناء مد صوت میں تمام غیر اللہ کو حاضر فی الذہن کر کے ان کی نفی کرنا اور بعد میں الا سے اثبات کرنا تکمیل توحید کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ بلا مد صوت کہنا چاہئیے کیونکہ ممکن ہے کہ مد صوت کے اثنا میں اسے موت آجائے اور الا اللہ یعنی اثبات توحید سے محروم رہ جائے۔ ہر دو خیال جائے خود صحیح ہیں۔ مگر حق اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کافر اس کلمہ کو بغرض اظہار ایمان پہلی دفعہ زبان پر لائے تو مد صوت نہیں چاہیے تاکہ بہت جلد اقرا توحید سے عہدہ برا ہو جاوے۔ ہاں اگر کوئی شخص مومن بطور تقویت و تجدید ایمان کے زبان پر لائے تو مد صوت بہتر ہے۔ تاکہ تمام غیر اللہ کو حاضر فی الذہن کر کے ان کی نفی کرے۔

مسئلہ

واضح ہو کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کے تلفظ میں لوگوں کے مدارج مختلف ہیں۔

(ا) اول طبقہ کے وہ لوگ ہیں جو صرف زبانی اقرار تک محدود رہتے ہیں۔ جس کا اثر یا حکم یہ ہے کہ ان کے جان و مال سیف اسلام سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کما قال علیہ الصلوۃ والسلام امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الا الہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حکم ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتی کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ سو جب وہ ایسا کر چکیں تو ان کے نفوس و اموال بدوں اس حالت کے کہ حق شریعت میں ان پر مواخذہ عائد ہو سکے۔ ہر ایک حالت میں محفوظ ہو جائیں گے۔ اس طبقہ میں مومن، منافق، کافر، مشرک، صدیق زندیق سب شریک ہیں۔ اور ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

(ب) طبقہ دوم کے وہ لوگ ہیں جو اقرار زبان کے ساتھ اعتقاد قلبی بھی رکھتے ہوں مگر بطور تقلید نہ بطور تحقیق چونکہ ایمان باللہ میں تقلید صحیح نہیں بلکہ ہر ایک کو بقدر استطاعت دلائل و براہین سے حقیقت توحید کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے علماء نے اختلاف کیا ہے کہ ایسے مقلد کا ایمان صحیح ہے یا نہیں؟ مگر یہ بالاتفاق صحیح ہے۔ کہ ایسا شخص عارف نہیں کہلا سکتا۔

(ج) طبقہ سوم کے وہ لوگ ہیں جو اقرار و اعتقاد کے ساتھ دلائل ظنیہ کا علم بھی رکھتے ہوں۔ مگر دلائل قاطعہ کے درجہ سے قاصر ہوں۔ اس مقام کے لوگ وساوس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

(د) طبقہ چہارم کے وہ لوگ ہیں جو حقیقت توحید کا بذریعہ دلائل قطعیہ علم رکھتے ہوں۔ گو وہ مقام مشاہدہ، مکاشفہ، تجلی سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کا علم یقینی ہونے کی وجہ سے انہیں دیگر طبقات سے خاص امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کی

تعداد بہت قلیل ہوتی ہے۔

(ہ) طبقہ پنجم کے وہ لوگ ہیں جن کو اصحاب مشاہدات بولتے ہیں۔ ان کی تعداد اقل قلیل ہے۔ اور ان میں بھی بے شمار مدارج ہوتے ہیں۔

مناسبت مقام کے رو سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب مکاشفات کے مدارج کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

واضح ہو کہ ارباب حقیقت نے تو مکاشفات کے لئے چھ مدارج قائم کئے ہیں۔ تین تو مبتدی لوگوں کے لئے ہیں۔ اور باقی تین منتہی لوگوں کے لئے مبتدی لوگوں کے لئے جو مدارج قائم کئے گئے ہیں۔ انہیں لوائح' لوامع' طوالع' بولتے ہیں۔ توجیہ ان مدارج کی یہ ہے کہ انوار معرفت کا انکشاف اگر اس طرح ہو کہ انکشاف کے ہوتے ہی پھر استتار (اختفاء) کی حالت عود کر آئے۔ جس طرح کہ برق چمک دے کر رہ جاتی ہے تو ایسی حالت کو لوائح کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک عارف اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

والفترقنا حولاً فلما التقينا　　كان تسليمه على وداعاً

یعنی دوست سے سال بھر جدا رہا اور جب ملاقات ہوئی تو اس قدر جلدی مفارقت ہوگئی کہ اس کا سلام زیارت سلام وداع تھا۔ مگر یہی حالت جب بار بار عود کرتی ہے اور قلب سلیم میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو انکشاف مذکورہ بالا کو ایک گونہ استقلال ہو جاتا ہے۔ اور حالت تجلی دیرپا ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کو لوامع ۔سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اگر اس مقام سے زیادہ ترقی حاصل ہو اور تجلیات قوی طور پر وارد ہونے لگیں تو انہیں طوالع بولتے ہیں مگر یہ حالت بھی خطر زوال سے محفوظ نہیں ہو سکتی ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تجلیات کے قوی ہونے کی وجہ سے ان کا اثر بالکل زائل نہیں ہو جاتا بلکہ ان کے انوار کے برکات قلب پر لگاتار موجود رہتے ہیں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے کہ آیۃ قرآنیہ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا میں۔

منتہی لوگوں کے مدارج انکشاف کو الفاظ محاضرہ۔ مکاشفہ۔ مشاہدہ کے

ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ محاضرہ حضور قلب کی اس حالت کا نام ہے جس میں دلائل وبراہین حقہ متواتر قلب پر وارد ہونے لگتے ہیں جن سے قلب میں ایک ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے جس کی روشنی سے سالک اپنے سیر میں کامل طور پر مستعد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مکاشفہ کی حالت ہے جس سے سالک دلائل وبراہین سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے۔ محاضرہ کی حالت میں سالک اختیار رکھتا ہے کہ دلیل سے مدلول کی طرف انتقال کرے مگر مکاشفہ میں دلائل سے حضرت حق کی طرف منتقل ہونے میں سالک کا اختیار نہیں ہوتا۔ بلکہ جونہی کسی امر کا مشاہدہ کرتا ہے بلا اختیار حضرت حق کی طرف منجذب ہو جاتا ہے اس کے بعد مشاہدہ کا مقام ہے یہ وہ حالت ہے جس میں انوار تجلیات کا سلسلہ لگاتار بلا انقطاع جاری رہتا ہے اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے فرض کر لیا جاوے کہ تجلی شب تاریک میں بلا وقفہ متواتر اپنی چمک دیتی رہے اور ایک آن بھی منقطع نہ ہو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں رات کا سماں بالکل دن کا سا نظر آئے گا یہی حالت ہوتی ہے قلب سلیم کی اس وقت جب کہ انوار تجلیات کا سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے یہ مقام غایت ترقی پر مبنی ہے اور اسی کی طرف کسی کامل نے یوں اشارہ کیا ہے۔

ليلي بوجهك مشرق　　وظلامه فی الناس ساری

والناس فی سدف الظلام　　ونحن فی ضوء النهار

یعنی میری سیاہ رات تیرے جمال جہانتاب سے روشن ہو گئی ہے اور اس کا اندھیرا دوسرے لوگوں تک پہنچ گیا ہے اور وہ اندھیرے میں پڑے ہیں اور ہم دن کی روشنی میں ہیں۔

مذکورہ بالا ہر سہ مراتب کی مثال خواب　　اور بیداری کی سی ہے یعنی جس طرح ان مدارج کے انکشاف میں بلحاظ خفا اور وضاحت کے امتیاز ہوتا ہے اس طرح محاضرہ' مکاشفہ' مشاہدہ میں جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے خفی و جلی ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ میں حقائق اشیاء بلا کسی قسم کے خفا کے ہو بہو منکشف ہوتی ہیں۔

واضح ہو کہ مقام مشاہدہ نہایت عالیشان مقام ہے اس لئے اس مقام میں کوئی لونے سے اونے فتور بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے ایک حدیث میں حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں انه لیغان علی قلبی وانی لاستغفر اللّٰه فی الیوم واللیلة سبعین مرة یعنی میرے قلب پر ایک قسم کی تیرگی سی آجاتی ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے رات دن میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں (مراد کثرت استغفار سے ہے) اس حدیث کی توجیہ میں چند اقوال ہیں۔ اول یہ کہ بمقتضائے بشریت ایک گونہ سستی یا غفلت عارض ہو جاتی ہے۔ تو میں اس کے رفع کرنے میں استغفار سے مدد لیتا ہوں۔ دوم یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مدارج عالیہ پر ترقی کرتے رہتے تھے پس جب ایک مقام سے دوسرے مقام پر ترقی پاتے۔ اور موجودہ مقام کو سابق کی نسبت برتر پاتے تو سابق کو ادائے حق عبودیت کے رو سے حقیر سمجھتے اور اسی لئے استغفار کی طرف ملتجی ہوتے تاکہ اس مقام میں جو تقصیر ادائے حق عبودیت میں واقع ہوئی ہے۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ سوم یہ کہ جب مقام اعلیٰ پر ترقی ہوتی تو اس مقام کے معارف و اسرار میں اس قدر استغراق ہوتا کہ اس کی محویت میں تبلیغ رسالت کے فرض میں ایک گونہ تقصیر ہو جاتی۔ اس لئے حضور بذریعہ استغفار اس تقصیر سے بریت حاصل کرتے بہر صورت اس حدیث میں حضور علیہ السلام کے استغفار کی حقیقت کا مفہوم حضور علیہ السلام کے ترقی مدارج کی کیفیت کے سمجھنے پر منحصر ہے کیونکہ ہر ایک مقام میں بوجہ تعلق بشریت کچھ نہ کچھ آثار بشریت کا موجود ہونا ضروری ہے جو اس سے اگلے مقام پر ترقی کرنے سے خفیف ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے اگلے مقام پر اور بھی خفیف صورت میں رہ جاتے ہیں علی ہذا القیاس انہیں آثار خفیفہ بشریت کے بقیہ پر حضور علیہ السلام کو استغفار کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ اور یہی اس حدیث کی صحیح توجیہ ہے اور انہیں بقایا آثار بشریت کو حضور علیہ السلام کی نسبت قرآن مجید میں ذنب سے تعبیر کیا گیا۔ حیث قال واستغفر لذنبک گویا ذنب کا لفظ محض بطور اشتراک اسمی استعمال کیا گیا ہے

مخالفین اس آیت میں لفظ ذنب سے وہی حقیقت ذنب اخذ کیا کرتے ہیں جو عوام الناس کے لئے مقرر ہے جس میں ہر ایک قسم کے گناہ کا مفہوم داخل ہے معاذ اللہ اور وہ نہیں سمجھتے کہ مقربین بارگاہ کے حق میں خفیف سے خفیف آثار بشریت کا وجود بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے کما قیل۔

وجودك ذنب لا یقاس بها ذنب

یعنی آثار بشریت کا خفیف سے خفیف تعلق بھی گناہ عظیم ہے یہی معنی ہیں جملہ حسنات الابرار سیئات المقربین کے۔

امام غزالی اپنی کتاب المقصد الاسنیٰ میں لکھتے ہیں کہ اسم اللہ منجملہ ننانوے اسماء ذات باری کے اعظم الاسماء قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ دلالت کرتا ہے۔ اس ذات اقدس پر جو موجود حقیقی ہے اور جو تمام کمالات حقیقیہ کی جامع ہے حتیٰ کہ اس کے مفہوم میں دیگر تمام صفات کمالیہ مثلاً علم قدرت' ارادہ' سمع' بصر وغیرہ کا مفہوم بھی شامل ہے اور کوئی دوسرا اسم اس قدر جامعیت کمالات پر مشتمل نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ نہ تو حقیقۃً کسی غیر پر اطلاق کیا جا سکتا ہے نہ مجازاً حالانکہ دیگر اسماء کا اطلاق مجازاً غیر پر کیا جا سکتا ہے مثلاً بطور مجاز' رحیم' علیم' کریم' حلیم وغیرھا اسماء کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے چونکہ ہر ایک اسم ذات باری کے مقتضاء سے انسان کامل کو ایک خاص بہرہ حاصل ہوتا ہے اس لئے اس اسم جلالت سے عارف کامل کو یہ بہرہ ملتا ہے کہ اس کا قلب تمام ماسوا سے اعراض کر کے ذات واحد میں مستغرق ہو جاتا ہے اور بجز ذات حقیقی کے کسی چیز سے نہ تو خوف کرتا ہے نہ اس سے امید رکھتا ہے بلکہ تمام اشیاء کے بطلان وجود کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور کسی چیز کو وجود حقیقی سے موجود نہیں دیکھتا یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عرب کے تمام اشعار میں لبید کا قول۔

الا کل شئی ماخلا اللّٰه باطل
وکل نعیم لا محالة زائل

اصدق الاقوال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بجز ذات واحد کے تمام اشیاء نیست اور سب لذتیں معرض زوال میں ہیں۔

خاصیت

جو شخص ہزار مرتبہ روزانہ پڑھے اللہ تعالیٰ اس کو کمال یقین نصیب فرماویں اور جو شخص جمعہ کے روز قبل نماز جمعہ کے پاک و صاف ہو کر خلوت میں دو سو بار پڑھے اس کا مطلب آسان ہو خواہ کیسا ہی مشکل ہو اور جس مریض کے علاج سے اطباء عاجز آگئے ہوں اس پر پڑھا جاوے تو اچھا ہو جاوے بشر طیکہ موت کا وقت نہ آگیا ہو۔

دعاء

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهوعلى كل شئى قدير الحمد لله وسبحان الله ولا اله الا الله والله اكبر ولاحول ولا قوة الا بالله. (حصن حصين)

اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ

جل جلالہ

جل جلالہ

(ا) اہل عربیت اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ لفظ (رحمٰن عربی ہے مگر ثعلب نحوی کا خیال ہے یہ لفظ عبرانی ہے جو اصل میں رحمانا تھا۔ اہل عرب نے خاء معجمہ کو حاء مہملہ سے بدل لیا اور حرف الف کو اخیر سے حذف کر دیا ثعلب کے وجوہ معہ امام رازی نے اپنی کتاب لوامع البینات میں لکھے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور رحمت سے مشتق ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں کہ لفظ رحمٰن یقیناً رحمت سے مشتق ہے اور یہ رائے واقعی صحیح ہے۔ کیونکہ اہل عرب کے ہاں یہ لفظ مروج تھا عمرو بن زید بن نفیل کا شعر ہے۔

ولكن اعبدالرحمٰن ربی　　　ليغفر ذنبی الرب الغفور

(ب) علماء نے حقیقت رحمت میں بہت کلام کیا ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ رحمت ذات باری کی صفت ہے جس کے معنی ارادہ ایصال ثواب و خیر کے ہیں اس صورت میں رحمت صفت ازلی ہو گی یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں اہل ایمان کے حق میں عطاء نعمت کا ارادہ کیا تھا دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ رحمت کا مفہوم صرف ارادہ خیر تک محدود نہیں بلکہ ایصال خیر اور دفع شر ہر دو کا مفہوم

اس میں شامل ہے۔ یعنی رحمت صفت فعل ہے۔ نہ صفت ذات مگر حق یہ ہے کہ گو بطریق عموم قرآن مجید میں ہر ایک قسم کی خیر و نعمت پر لفظ رحمت کا اطلاق ہوا ہے مگر یہ لفظ حقیقۃً دفع بلاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ صرف ارادہ خیر مستلزم کمال حقیقی نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے ان للّٰہ مائة رحمة وانه انزل منها واحدة الى الارض فقسمها بين خلقه فبها يتعاطفون وبها يتراحمون وآخر تسعاً و تسعين لنفسه يرحم بها عباده يوم القيامة یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک کو اس نے اپنے بندوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بندگان خدا باہم پیار اور محبت کرتے ہیں۔ اور ننانوے رحمتیں اس نے اپنی ذات کے لئے مخصوص کی ہیں۔ جن کو قیامت کے دن اپنے بندوں کے حق میں ظاہر کرے گا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف ارادہ خیر کے معنی صحیح نہیں۔ اس لئے رحمت صفات فعل میں سے ہے۔ نہ صفات ذات میں سے۔

(ج) علماء نے اس مسئلہ میں بہت کچھ بیان کیا ہے کہ آیا کفار کے لئے بھی دینی یا دنیوی نعمتیں ہو سکتی ہیں؟ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ دینی نعمتیں کفار کے لئے قطعاً موجود نہیں۔ دنیوی نعمتوں میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کفار کے لئے دنیوی نعمتیں بھی مقدر نہیں۔ اور وہ لذات و منافع اور صحت و سلامت جو انہیں حاصل ہیں۔ محض بطور استدراج ہیں۔ جن کا انجام ان کے حق میں مفید نہیں۔ جیسے وہ لذیذ شے جس میں زہر ملا دی گئی ہو۔ گو بظاہر لذت بخش ہے۔ مگر بہر حال کھانے والے کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام نعمتیں جن سے کفار متمتع ہو رہے ہیں۔ ان کے حق میں بالآخر موجب ضرر ثابت ہونے والی ہیں۔ اس لئے حقیقتاً ان پر لفظ نعمت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیۃ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ میں محض نظر بظاہر بطور مجاز ان اشیاء کو نعمت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اگر وہ لوگ ایمان لے آتے تو وہ اشیاء ظاہر و باطن میں

ان کے حق میں نعمت ثابت ہوتیں۔ لیکن ان کے کافر ہونے کی وجہ سے یہ اشیاء بطریق ظاہر صورت میں ان کے حق میں نعمت تھیں۔ نہ حقیقت میں کیونکہ یہی اشیاء ان کے لئے موجب معصیت و طغیان ہو کر ان کے لئے باعث ہلاکت و عذاب ثابت ہوئیں۔ اس لئے فی الحقیقت نعمت نہیں ہو سکتیں۔ معتزلہ کا مذہب ہے کہ کفار کے لئے دینی اور دنیوی ہر دو قسم کی نعمتیں ہیں۔ دنیوی تو ظاہر ہیں۔ اور دینی کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلائل و اسباب سعادت ان کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جن سے وہ منتفع ہو سکتے ہیں۔ مگر حق وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ یعنی کیا وہ کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جن اشیاء یعنی مال و فرزند سے ان کی امداد کرتے ہیں تو ان کے لئے خیر و سعادت میں جلدی کرتے ہیں۔ (نہیں) بلکہ وہ اس امر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمتوں کی ان کے لئے نفی کر دی کہ وہ خیرات نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء ان کے حق میں در حقیقت نعمت نہیں۔

(د) یہ امر بھی قابل غور ہے کہ رحمت الٰہی اور رحمت بندگان میں بلحاظ کمال و نقصان کے کئی ایک وجوہ سے تفاوت ہے۔

اولاً وہ رحمت جو بندگان خدا سے ظاہر ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قلب بندہ میں پیدا کرنے سے موجود ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رحمت الٰہی اکمل ہے۔ بہ نسبت رحمت بندگان کے۔

(ثانیاً) بندگان خدا سے جس رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ در حقیقت ایک قسم کی رقت قلب کا نتیجہ ہے۔ اور یہ رقت قلب ایک قسم کا الم ہے۔ جس کو دل سوزی کہتے ہیں اور یہ امر کسی خارجی حالت سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اس امر سے بری ہے کہ وہ کسی غیر سے متاثر ہو مثلاً باپ اپنے بیٹے کی حالت خستہ پر رحم کر کے اس کی اصلاح میں سعی کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دل سوزی کے الم کو جو بیٹے کی خستگی کی وجہ پیدا ہوا تھا۔ رفع کرتا ہے۔ یا کوئی شخص بامید ثواب آخرت غرباء پر صدقہ و خیرات تقسیم کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ وہ یہ سوچتا ہے کہ عذاب جہنم سے نجات پائے گا۔ علی ہذا القیاس انسان سے جس قدر رحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا رحمت کرنا کسی غرض پر مبنی نہیں۔ وہ جواد مطلق ہے۔ اور متاثر ہو کر یا کسی غرض کے تابع ہو کر وہ رحمت کا اظہار نہیں کرتا بر خلاف انسان کے کہ اس میں یہ ہر دو باتیں موجود ہیں۔ جو ذات باری کے لئے موجب نقص ہیں۔

(ثالثاً) بندہ دوسرے شخص سے جس قدر احسانات کرتا ہے ان کے اسباب وہی امور ہوتے ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام حاصل ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ در حقیقت انسان بجائے خود کسی احسان کا مالک نہیں بلکہ جو احسان کرتا ہے اس کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اس لئے حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی منعم حقیقی ہے اور اس لئے وہ بدرجہ اکمل رحیم ہے۔

(رابعاً) بندہ جب احسان کرتا ہے تو بمقدار بذل احسان اس کے خزانہ اور مال میں کمی واقع ہو جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے خزانہ رحمت میں کمی و بیشی کو دخل نہیں کیونکہ اس کے مقدورات لامتناہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بذل کرتے وقت اس کے دل میں ایک خیال مخالف جو مانع بذل ہوتا ہے۔ پیدا ہو کر احسان سے روکتا ہے یا کمی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ امر ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۵) رحمان اور رحیم ہر دو اسم رحمت سے مشتق ہیں۔ اگر ان ہر دو میں معنی کے رو سے کچھ فرق نہ ہو تو ان ہر دو کو مترادف ماننا پڑے گا۔ مگر ایک جم غفیر علماء محققین کا یہ مذہب ہے کہ رحمٰن میں رحیم کی نسبت صفت رحمت کا مبالغہ ہے۔ کیونکہ ترکیب یا رحمٰن الدنیا اور رحیم الاخرۃ سے اس امر کا

پورا ثبوت ملتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت دنیا مومن و مشرک اور مطیع و عاصی سب کو شامل ہے۔ جس سے ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے۔ اور رحمت آخرت سے صرف اہل ایمان کا مخصوص بالرحمت ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے رحیم خاص ہے اور رحمٰن عام

چنانچہ امام جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم رحمٰن مختص بذات باری ہے۔ مگر اثر کے رو سے عام ہے۔ کیونکہ وہ اس اسم کے رو سے نیک و بد اور مومن و کافر سب کو شامل ہے اور اسم رحیم اطلاق میں عام ہے۔ کیونکہ ذات باری اور بندوں پر بولا جا سکتا ہے۔ مگر بلحاظ اثر کے خاص ہے کیونکہ رحمت آخرت کا ظہور صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ وزن رحمٰن کے مبنی بر مبالغہ ہونے پر یہ دلیل بھی جاری ہو سکتی ہے کہ اس کا وزن فعلان کا ہے۔ جیسے غضبان (بڑے غضب والا) سلآن (بڑا پر ہونے والا) شبعان (بڑا شکم سیر) مگر رحیم فعیل کا وزن ہے جو بسا اوقات مبنی فاعل کے ہوتا ہے۔ جیسے سمیع بمعنی سامع وغیرہ' مع ہذا کلمہ رحمٰن و رحیم ایک ہی مادہ سے مشتق ہیں۔ مگر رحمٰن کے حروف پانچ ہیں اور رحیم کے چار اس لئے ضروری ہے کہ رحمٰن کی بناء مبالغہ پر قائم کی گئی ہو بر خلاف رحیم کے اور ایک روایت میں جو ابو سعید سے مروی ہے۔ مسیح علیہ السلام کی نسبت مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رحمٰن الدنیا اور رحیم الاخرۃ اس سے بھی مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لفظ رحمٰن و رحیم کی تحقیق میں اس سوال کا جواب بھی ضروری ہے کہ کیوں لفظ رحمٰن کو رحیم پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بتلایا کرتے ہیں کہ بزسہ اسماء اللہ رحمٰن اور رحیم میں ہم جنس ہونے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ جس طرح اسم اللہ بجز ذات باری کے کسی پر اطلاق نہیں کیا جاتا اسی طرح اسم رحمٰن بھی بجز ذات باری عزاسمہ کے دوسرے پر اطلاق نہیں پاتا۔ بر خلاف اسم رحیم کے چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا چونکہ اسم اللہ اور اسم رحمٰن میں ایک گونہ مشابہت تھی۔ لہٰذا ہر دو کو متصل بیان کرنا معنوی طور پر زیادہ قرین بلاغت ہے

دوم رحمت عامہ جو مفہوم رحمان ہے۔ بمنزلہ اصل کے ہے اور رحمت خاصہ جو مفہوم رحیم ہے بمنزلہ زائد علی الاصل کے ہے اس لئے رحمٰن کا مقدم لانا ضروری تھا۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اسم رحمٰن کا مقتضا جو مومن کو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندگان خدا پر رحم کرے اور ان کی خیر خواہی میں لطف و کرم سے کام لے نہ درشتی اور سختی سے اور اہل معصیت کو بنظر رحمت دیکھے۔ بنظر اذیت اور ہر ایک معصیت جو عالم میں ظاہر ہو اس کو اپنی معصیت سمجھ کر اس کے دور کرنے میں پوری سعی بجا لائے۔ اہل معصیت عذاب الٰہی سے بچ جائیں اور اس رحیم کا مقتضی یہ ہے کہ جہاں تک اس کی طاقت میں ہو اہل فقر و فاقہ کی حاجت برآری میں کوتاہی نہ کرے۔ اور جس طرح ہو سکے بذریعہ مال یا بذریعہ شفاعت یا کسی دوسرے طریق پر اس کی حاجت و مصیبت کو رفع کرے۔ اور اگر کچھ قدرت نہ رکھتا ہو تو دعا سے کام لے۔ اور عدم قدرت اس طرح پر اندوہ زدہ ہو کہ وہ حاجت یا مصیبت خود اسی کی ذات پر وارد ہے۔

تنبیہ

یہ خیال عام طور پر پیدا ہوا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ اور رحیم کا قاعدہ ہے کہ وہ صاحب قدرت ہونے کی صورت میں کسی مصیبت زدہ کو مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ اس کی مصیبت کو رفع کرتا ہے۔ مگر دنیا میں ہزاروں لاکھوں بندگان خدا انواع و اقسام کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کامل القدرت اور کامل العلم ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبت کو دور نہیں کرتا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال صفات ذات باری میں غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ عالم کائنات میں ہو رہا ہے۔ نہایت عدل و حکمت پر مبنی ہے۔ دیکھو ماں اپنے بچہ کو عمل جراحی سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ مگر باپ جو انجام بینی سے کام لیتا ہے بچہ کو جراح کے حوالہ کر دیتا ہے۔ جو اس

پر اپنا عمل جراحی کرتا ہے۔ بظاہر ماں بچہ کی خیر خواہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ در حقیقت نادان خیر خواہ ہے۔ اور باپ دشمن معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل وہ بچہ کا بہترین خیر خواہ ہے کیونکہ اس کی نظر ایک ایسی مصلحت عظیم پر محدود ہوتی ہے جس کو ماں مدنظر نہیں رکھتی۔ اگر باپ بچہ کو جزی تکلیف سے بچانے کے لئے عمل جراحی سے اس کو محفوظ رکھے تو بچہ زخم کے ضرر سے ہلاک ہو جائے۔ اس تمثیل سے صرف یہ مقصود ہے کہ ایک مصلحت عظیمہ کی تکمیل میں جزئی تکلیف کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا فطرت عالم میں غور کرو کہ ہر ایک امر خیر کے ساتھ کس طرح جزی شر شامل ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کارخانہ حکمت میں حوادث کا وجود پذیر ہونا عین خیر پر مبنی ہوتا ہے مگر کسی حادثہ کے دوسرے اشیاء کے ساتھ متعلق ہونے پر شر جزی کو اس حادثہ میں دخل ہو جاتا ہے۔ باران رحمت نزول عین خیر ہے مگر کون کہتا ہے کہ اس میں جزی شر شامل نہیں ہوتا۔ انسان اپنی کوتہ نظری سے بسا اوقات شر جزی کو ملحوظ رکھ کر مصلحت عظیمہ کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی جن امور کو تم برا سمجھتے ہو انہیں میں تمہاری مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ مگر سلسلہ اسباب کے ربط پر آگاہ نہ ہو کر تم انہیں ناپسند رکھتے ہو۔ الغرض کسی امر کے ذات باری سے صادر ہونے میں کوئی شر داخل نہیں۔ بلکہ محض خیر ہی صادر ہوتی ہے۔ مگر جب اس امر کو اپنے موارد خارجی سے تعلق ہوتا ہے تو وہی ایک امر بعض موارد کے حق میں تو عین خیر ہوتا ہے۔ اور دیگر بعض کے حق میں شر، اور اگر جہت تعلق خارجی کو ہم نظر انداز کر دیں تو پھر شر کا وجود ہی ناپید ہے مطلب یہ کہ خیر مقصود بالذات ہے۔ اور شر مقصود بالعرض یہی وجہ ہے کہ کلام مجید میں بیدك الخیر ارشاد فرمایا نہ بیدك الخیر والشر

مذکورہ بالا اصل پر غور کرنے کے بعد اس امر کا سمجھ لینا ہرگز دشوار نہیں کہ کسی مصیبت زدہ کا مصیبت میں مبتلا ہونا ایک ایسے مخفی سلسلہ اسباب کے ربط کا نتیجہ ہے جس کو عوام الناس ہرگز اپنے ادراک میں نہیں لا سکتے۔ اور

بجز عارفان عالی مقام کے کسی کو اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر ربط اسباب کی حقیقت کا انکشاف اہل دنیا پر ہو جاتا تو سلسلہ کائنات کا انتظام کبھی درست نہ رہ سکتا۔ بلکہ ہزارہا مفاسد کا باعث ہوتا اور یہ امر حکمت ذات باری کے منافی ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ جب شر جزی کے بدون بھی امر خیر کا صدور ممکن تھا تو پھر خیر کے ساتھ شمول شر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال بھی محض انسان کی عقل نارسا کا نتیجہ ہے کیونکہ کسی امر کے ممکن یا محال ہونے کا فیصلہ کر لینا کوئی سرسری بات نہیں جو لوگ اللہ تعالیٰ کے صفات متضاد کا علم رکھتے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ عالم کائنات کی فطرت ہی ہر ایک قسم کے متضاد امور کی متقاضی ہے اور اسی سے اس کے کامل الصفات اور بے مثل ہونے کا ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ صدور حوادث کے اسباب اور ان کے روابط کا علم انداز عقل سے کہیں بالاتر ہے۔ ہاں مگر یہ محقق ہے کہ بمقتضائے سبقت رحمتی غضبی امر خیر ارادہ الٰہی میں اولاً اور بالذات داخل ہے۔ اور امر شر ثانیاً اور بالعرض چونکہ اس حقیقت پر آگاہ ہونا ہے مسئلہ جبر و قدر کی بحث کا مقتضی لہٰذا اس دقیق مقام پر بجز سکوت کے کوئی چارہ نہیں اور زیادہ نکتہ چینی سے زوال ایمان کا خطرہ ہے۔ لہٰذا ہم ناظرین کو اسی قدر تفصیل پر قانع کرنا مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنا ذوق و وجدان پر موقوف ہے۔ بحث و جدل کو یہاں دخل نہیں۔ فتدبر

واضح ہو کہ وصف رحمت مقام عبودیت کے کمال کا پتہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو مختلف مواقع پر اس وصف سے متصف ظاہر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ اور فرمایا بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ اور پھر فرمایا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ اور خود حضور علیہ السلام نے صدیق اکبرؓ کی نسبت ارشاد فرمایا۔ ارحم امتی بامتی ابوبکر یعنی سب سے بڑھ کر میری امت کے حق میں ابوبکر رحیم ہیں۔ اور عام طور پر مقام تلقین رحمت میں ارشاد فرمایا الراحمون یرحمہم الرحمٰن ارحموا من فی

الارض یرحمکم من فی السماء یعنی رحمت کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحمت کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے گا۔

استدعا رحمت کے متعلق حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی نسبت مروی ہے کہ آپ عید فطر کے لئے مصلے کی طرف نکلے اور نماز کے بعد یوں دست بدعا ہوئے کہ خدایا مجھ پر رحم فرما کیونکہ تو نے فرمایا ہے۔ اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اور اگر میں محسنین میں شامل نہیں تو صائمین سے تو ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا اور اگر میں صائمین میں بھی نہیں تو مومنین میں تو ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا اور اگر میں مومنین میں بھی نہیں تو تیری ایک پیدا کردہ شے ہوں۔ اور تو نے فرمایا ہے۔ رحمتی وسعت کل شئی اور اگر میں یہ بھی نہیں تو میں مصیبت زدہ تیری رحمت سے محروم ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَةٌ غور کرو کہ اہل معرفت کو کس کس طریق پر بارگاہ رب العزت میں مناجات کرنے کا ڈھنگ تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت قرآن مجید کو سمجھتے اور اس سے منتفع ہوتے تھے۔ اللھم ارزقنا بحرمت نبی الرحمة وعلی الہ الطیبین

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ ذات باری اہل افتقار کے لئے رحمان اور اہل افتخار کے لئے رحیم ہے۔ جب اس کے جلال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے عقول مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی طرف محتاج ہوتے ہیں اور جب اس کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو قوت حیات پاتے ہیں اور افتخار کرتے ہیں۔ بعض لکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں ستر گناہ کرتا ہے۔ اس لئے رحمٰن ہے اور آخرت میں مغفرت اور اس لئے رحیم ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا رحمٰن ہے کہ جب اس سے سوال کیا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ اور آپ ایسا رحیم ہے کہ جب سوال نہ کیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ چنانچہ ابوہریرہؓ سے مروی ہے

کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ من لم یسئل اللہ یغضب علیہ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ اسی خیال کو کسی صاحب دل نے یوں موزون کیا ہے۔

اللّٰہ یغضب ان ترکت سواله

وابن آدم حین یسئال یغضب

ابوبکر وراق فرماتے ہیں رحمان بالنعماء ہے اور رحیم بالا لاء نعماء وہ ہے جو اس نے یہاں عطا فرمادیا اور آلاء وہ ہیں جن کی بابت اس نے خبر دی۔ محمد بن علی ترمذی لکھتے ہیں کہ وہ رحمان ہے۔ اس لئے کہ نار جہنم سے نجات بخشتا ہے اور رحیم ہے اس لئے کہ جنت میں داخل فرماتا ہے۔ حارث بن اسد محاسبی لکھتے ہیں کہ وہ رحمٰن ہے کیونکہ مصائب کو دور کرتا ہے اور رحیم ہے کیونکہ قلوب کو انوار و معرفت سے منور کرتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ وہ رحمٰن ہے کیونکہ اس نے قرآن مجید کی تعلیم فرمائی۔ حیث قال اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآن اور رحیم ہے۔ کیونکہ تکریم و تسلیم کے ساتھ عزت افزائی کرتا ہے۔ حیث قال سَلَامٌ قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ بعض محققین نے لکھا ہے کہ اسم رحمٰن میں ایسی رحمت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ جو مخصوص بذات باری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ اور رحیم میں رحمت عامہ کی طرف اشارہ ہے جو غیر اللہ سے بھی صادر ہو سکے۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے۔ مسیلمہ کذاب کے متباع مسیلمہ کو رحمٰن کہا کرتے۔ چنانچہ ان کا ایک شاعر کہتا ہے۔

فانت غیث الوری لازلت رحمانا مگر یہ محض بطور جہالت و تعنت تھا نہ بطور حقیقت۔

خاصیت

الرحمٰن

ہر نماز کے بعد سو بار پڑھنے سے قلب کی غفلت اور نسیان دفع ہو اور

بکثرت اس کا ذکر کرنے والا ہر امر مکروہ سے محفوظ رہے اور اگر اس کو مشک و زعفران سے لکھ کر کسی محفوظ جگہ بد خلق آدمی کے گھر میں دفن کر دیا جائے تو اس میں حیا اور ترحم اور مسکنت پیدا ہو۔

الرحیم

جو شخص روزانہ سو بار پڑھے اس کے قلب میں رقت اور شفقت پیدا ہو اور جس کسی کو امر ناگوار کا اندیشہ ہو الرحمٰن الرحیم کی کثرت کرے یا لکھ کر باندھے اور اگر اس کو لکھ کر پانی سے دھو کر وہ پانی کسی درخت کی جڑ میں ڈال دیں اس کے پھل میں برکت ہو اور اگر کسی کو گھول کر پلاوے اس کے دل میں کاتب کی محبت پیدا ہو۔ اسی طرح اگر طالب و مطلوب کا نام مع والدہ کے لکھے اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

دعاء

اعوذ بکلمات اللہ التامات التی لایجاوزھن برولا فاجر من شرما ینزل من السماء ومایعرج فیھا ومن شرما ذرافی الارض وما یخرج منھا ومن شرفتن اللیل وفتن النھار ومن شرطوارق اللیل والنھار الا طارقاً یطرق بخیر یا رحمن۔ (حصن حصین)

والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم۔ (ترمذی)

المَلِکُ

جل جلالہ

اس باب سے مختلف اسماء کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ الملک مالک الملک والملکوت الملیک العالک مگر اسماء حسنیٰ میں صرف دو ہی اسم آئے یعنی الملک اور مالک الملک۔

لفظ ملک (بکسر میم) کی نسبت علمائے عربیت کے دو قول مروی ہیں۔ اول یہ کہ ملک کسی شے میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ ملک قدرت تصرف کو کہتے ہیں۔ ان ہر دو توجیہ میں جو فرق ہے۔ اسے علمائے متکلمین زیر بحث لاتے ہیں۔ جو محض لفظی مناقشات ہیں اور بے سود اصل لغت میں ملک بمعنی ربط اور شد کے ہے۔ قال الشاعر۔

ملکت بھاکفی فانھرت فتقھا
یری قائم من دونھا ماوراء ھا

(زخم کی فراخی کا ذکر کرتا ہے کہ میں نے زخم کے لئے اپنے ہاتھ کو نیزہ پر مضبوط کیا اور اس قدر فراخ زخم لگایا کہ اس طرف کا کھڑا ہونے والا زخم کی دوسری طرف کو دیکھ سکتا تھا)

غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ربط اور شد کا مفہوم قدرت تامہ کا منافی نہیں۔ چونکہ قدرت تامہ کی مالک بجز ذات باری کے کوئی اور چیز نہیں اس لئے حقیقی طور پر انسان کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔ لہذا ملک بمعنی سلطنت صرف ذات باری ہی کا وصف ہے اور بس' اور چونکہ تصرف فرع ہے ہر ملک کی اسی لئے عبد بالاستقلال مولیٰ کے مال میں کچھ تصرف نہیں کر سکتا آیۃ للہ الامر من قبل ومن بعد میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے ہاں عبد کو تملیک مولیٰ سے ایک عارضی تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً اس کو مالک نہیں کہا جا سکتا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اسم ملک اور مالک ہر دو میں وصف کا یکسان مفہوم نہیں بلکہ اسم ملک میں مبالغہ ہے۔ کیونکہ ملک مملوکات کثیرہ کے مالک ہونے پر دال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالک الدار یا مالک الفرس وغیرہ تو بول دیتے ہیں مگر ملک الدار اور ملک الفرس نہیں بول سکتے۔ معہ ہذا حضرت رب العزت اسم ملک اضافت سے اور نیز بلا اضافت دونوں طرح مستعمل ہے۔ اور مالک بجز اضافت مستعمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اسم مالک اور ملیک بلحاظ مبالغہ وصف کے یکساں نہیں بلکہ بالاتفاق ان میں وہی نسبت جو ناصر و نصیر اور عالم و علیم اور قادر و قدیر وغیرہ میں یعنی اسم ملیک میں زیادہ مبالغہ ہے۔ اور اسم مالک الملک اسم مالک اور ملک ہر دو کے معنی پر مشتمل ہے۔ کیونکہ اضافت ملک کی مملوک ذات باری ہونے پر دال ہے اور ملک سے قدرت تامہ اور تصرف مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ذات باری مالک قدرت و تصرف ہے۔ لفظ ملکوت' مالک بمعنی قدرت و تصرف کا مبالغہ ہے جیسے رغبت سے رغبوت اور رحمت سے رحموت وغیرہ اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ ملک اشارہ ہے ذات باری کے متصرف فی الاجسام ہونے کی طرف اور ملکوت سے عالم ملائکہ وارواح میں متصرف ہونا مراد ہے۔

یہ امر بذریعہ دلائل ثابت ہے کہ ذات باری مالک جمیع موجودات ہے اس لئے اگر ہم اس کے ملک کی تشریح کرنے لگیں تو ہمیں ایک ایک ذرہ کائنات کی حقیقت پر بحث کرنا ہو گی۔ جس سے ذات باری کے تصرف کامل کا ہم

علم حاصل کر سکیں۔ مگر تمام موجودات زمینی و آسمانی کا خیال تو ہوسکتا ہے۔ اگر ہم مچھر یا کسی مکھی کے ایک پر کی تشریح کرنے لگیں تو اس کے متعلق مختلف مباحث کو طے کرنے میں ہزاروں لمبی لمبی عمریں ختم ہو جائیں۔ مگر ہم سمندر سے ایک قطرہ کے برابر بھی علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی عدم امکان کی طرف اشارہ ہوا۔ آیۃ لَوْکَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ (یعنی اگر تمام روئے زمین سمندر سیاہی بن جائیں جس سے موجودات ذات باری کی حقیقت قلمبند کی جائے تو یہ سیاہی ختم ہو جائے گی اور اللہ کی موجودات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا) میں ہاں مگر بنظر اختصار و اجمال ہمیں آیۃ اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ الایۃ میں غور کرنا چاہئے۔

(ا) اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ ان الفاظ سے ذات باری کا متصرف مطلق ہونا ثابت ہے۔ کیونکہ عطا اور منع ہر دو پر یکساں قادر ہے۔

(ب) وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ان الفاظ سے اعزاز و اذلال پر اس کا قادر ہونا ثابت ہے۔

(ج) تُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی اللَّیْلِ۔ اس سے تقلیب لیل و نہار پر قادر ہونا ثابت ہے۔

(د) تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ان الفاظ سے اس کا احیاء و اماتت پر متصرف ہونا ثابت ہے۔

(ہ) وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ ان الفاظ سے اس کا رازق مطلق ہونا ثابت ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ مذکورہ بالا پانچ موارد سے ذات باری کا من کل الوجوہ قادر مطلق ہونا ثابت ہو رہا ہے اور ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عبد کبھی دائرہ احتیاج سے باہر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ ممکن ہے اور ہر ایک ممکن محتاج ہے۔ سو جس طرح وہ کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ کبھی کسی غیر اللہ کی طرف محتاج نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر اللہ کو تصرف کا حق حاصل نہیں

اس لئے غیر خود محتاج ہے۔ پس محتاج کا محتاج ہونا عقلاً ممتنع ہے۔ ہاں عارضی طور پر ہر ایک چیز غیر اللہ کی طرف محتاج ہے مگر فی الحقیقت سب کا محتاج الیہ ذات باری ہے۔ لہذا انسان کے مستغنی ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ جب وہ غیر اللہ سے بالکلیت منقطع ہو کر محض اللہ تعالیٰ ہی کا ہو رہے۔ اور ہر ایک کی حاجت سے مستغنی ہو جائے تو اس صورت میں ملک یا مالک مطلق ہو سکتا ہے۔ واضح ہو کہ اس رتبہ کا مالک بجز ذات جامع کمالات جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی شخص نہیں ہوا۔ اور اسی عدم احتیاج کی طرف اشارہ ہے۔ آیۃ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی میں ایک حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں۔

خیرت بین ان اکون عبدا نبیاً او ملکا نبیاً فاخترت العبودیۃ

یعنی مجھے اس امر کا اختیار دیا گیا کہ میں عبد نبی ہو جاؤں یا ملک نبی سو میں نے عبودیت ہی کو اختیار کیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص من کل الوجوہ اپنے مولا کا ہو کر رہتا ہے تو مولے خود اسی کا ہو جاتا ہے۔ اس لئے تمام مخلوقات اس شخص کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا نہیں بنتا کوئی چیز اس کی اطاعت نہیں کرتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل ہر ایک چیز کی ذات باری سے ہے۔ جب اصل کسی کو حاصل ہو جائے تو فرع (جمیع مخلوقات) خود اس کی تابع ہو جائے گی۔ اور جب اصل سے محروم رہا تو فرع بھی اس سے زائل ہو گی اسی نکتہ کو حضور علیہ السلام نے اس حدیث میں ظاہر فرمایا ہے اذا سئلت فاسئال اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ یعنی جب سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے اور جب مدد مانگو تو اسی سے۔

دوم یہ کہ قلب بمنزلہ ایک سلطنت کے ہے۔ جس میں سلطان روح حکومت کرتا ہے۔ اور نفس اس کا دشمن ہے اور ان دونوں میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے وزیر عقل سلطان روح کی طرف سے اور وزیر جہل سلطان نفس کی طرف سے باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ سلطان روح مملکت قلب میں اخلاق حسنہ نورانیہ کا لشکر پھیلانا چاہتا ہے۔ اور سلطان نفس عادات قبیحہ ظلمانیہ کا اور ہر دو کو بیرونی

امداد بھی ہوتی رہتی ہے۔ یعنی سلطان روح کی امداد کے لئے ملائکہ اور سلطان نفس کی امداد کے لئے شیاطین علیحدہ علیحدہ اپنا کام کرتے ہیں۔ ان دونوں لشکروں میں خوب مقابلہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر اگر عنایت الٰہی سلطان روح کے شامل حال ہو جائے تو سلطان نفس کا لشکر شکست پا کر مملکت سے خارج ہو جاتا ہے۔ ورنہ شیاطین کی حکومت غالب آکر مملکت قلب میں مختلف قسم کی خرابیاں ڈال دیتی ہیں۔ اور شہوت و غضب اور حرص و حسد وغیرہ کے سوا اور کسی چیز کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔

اس مثال میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سلاطین عالم میں تو اس قسم کا مقابلہ کبھی شاذو نادر ہوا کرتا ہے۔ مگر روح اور نفس میں ہر وقت یہ مخاصمہ جاری رہتا ہے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ کبھی سلطان روح کو غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی سلطان نفس کو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی شخص کبھی تو مشابہ ملک آسمانی ہو جاتا ہے اور کبھی وہی شخص ثانی شیطان اور بجز عنایت الٰہی اور رحمت ازلی کے کوئی چارہ نہیں اسی خیال پر انبیاء علیہم السلام کے ادعیہ میں بحضور باری عزاسمہ التجا رحمت مروی ہے۔ خلیل علیہ السلام کی دعا میں غور کرو۔ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْماً وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ یعنی خدایا مجھے حکمت دے۔ اور اہل صلاح کے ساتھ ملا دے حکمت کی استدعا سے مراد یہ ہے کہ مقابلہ نفس کی طاقت دے جس کا نتیجہ صلاح و تقویٰ ہو سکتا ہے۔ کلیم علیہ السلام کی دعا کو دیکھو رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ یعنی خدایا میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے اور میرے امر میں مجھے آسانی دے۔ اس دعا میں شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ میرے قلب سے آلائش جہل کو بالکل دور کر دے۔ جس کا نتیجہ تنگی اور ظلمت ہے اور امر میں آسانی دینے سے مراد یہ ہے کہ نفس اور شیطان کے مغلوب کرنے کی قوت عطا فرما جس کا نتیجہ قلب کا انوار معرفت سے منور ہونا ہے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں غور کرنا چاہئے۔ حیث قال اللّٰہ تعالی تعلیماً لہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقل

رب اعوذبک من ھمزات الشیاطین واعوذبک رب ان یحضرون یعنی خدایا میں شیاطین کی اندرونی رہ زنیوں سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نیز میں اس امر سے کہ شیاطین میرے پاس آسکیں۔ تیری پناہ میں آتا ہوں اس موقع پر قابل ضبط امر یہ ہے کہ جو شخص قلب کے ان حالات کا عارف ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت غیر اللہ سے اپنے تعلق کو قطع کرنے کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اپنے تئیں اس مولائے حقیقی کے سپرد کر دیتا ہے اور غیر سے اپنی امید منقطع کر لیتا ہے اور آفات و علائق سے بچا رہتا ہے اسی امر کی طرف بعض مشائخ نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ایجمل بالحر المرید ان یتذلل للعبید وھو یجد من مولاہ مایرید یعنی کسی خالص الارادت طالب کو ہرگز شایاں نہیں کہ عاجز بندوں کے سامنے فروتنی کا اظہار کرے۔ جبکہ وہ اپنی ساری مرادیں اپنے مولیٰ سے حاصل کر سکتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ مقام بہت اونچا ہے۔ اور ہر ایک ہوس ناک کو وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

سفیان بن عیینہؒ سے مروی ہے کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک شخص نظر پڑا اسے دیکھتے ہی میرے دل نے فیصلہ کر لیا کہ یہ شخص ضرور مخلصین میں سے ہو گا۔ یعنی اس کے قریب جا کر عرض کیا کہ آپ مجھے کچھ وصیت فرمائیں جس سے میں فائدہ اٹھاؤں اس نے مجھے جواب نہ دیا اور طواف میں لگا رہا۔ جب طواف سے فارغ ہو چکا تو مقام ابراہیم کے پیچھے اس نے دوگانہ ادا کیا اور پھر حجر (گرداگرد کعبہ اندرون حطیم از سوئے شمال) میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پاس جا بیٹھا اور پھر وہی مذکورہ بالا عرض کی۔ تب اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا تو جانتا ہے کہ تیرے رب نے کیا حکم دیا ہے یہ کہہ کر خود ہی فرمایا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں حی لایموت ہوں میری اطاعت کرو۔ میں تمہیں بھی مالک الملک بنا دوں گا۔ میں وہ بادشاہ ہوں کہ جب کسی کو امر کرنا چاہتا ہوں تو وہ امر میرے ارادہ کے ساتھ ہی واقع ہو جاتا ہے۔ میری اطاعت کرو۔ میں تمہیں بھی ایسا بنا دوں گا کہ جب تم کسی امر کا ارادہ

کرو گے وہ امر اسی وقت موجود ہو جائے گا۔ اتنا کہا اور وہ بزرگوار میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا میں حیران رہ گیا اور سمجھا کہ خضر علیہ السلام تھے۔

بعض حکایات میں مروی ہے کہ کسی امیر نے ایک خدا دوست صالح مرد کو کہا کہ اگر کوئی حاجت ہو تو مجھ سے فرمایئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے ہاں جو دو غلام ہیں وہ تمہارے حاکم ہیں بھلا میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں اپنی حاجت روائی کر سکتا ہوں۔ اس امیر نے عرض کیا کہ وہ کون سے دو غلام ہیں۔ اس مرد خدا نے جواب دیا۔ کہ شہوت اور غضب یہ ہر دو تیرے تو حاکم ہیں مگر میرے محکوم ہیں۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ سورۃ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے حکایۃ آیۃ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ میں ملک سے قدرت علی النفس مراد لی ہے اور وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ میں تاویل احادیث سے حکمت گویا ہر دو آیات علیحدہ علیحدہ قوت عملی اور قوت نظری کے کمال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ قال الشاعر۔

من ملك النفس فحر ماهو   والعبد من يملكه هواه

(آزاد وہی ہے جو نفس پر قادر ہے اور غلام وہ جس پر خواہش نفس حکمران ہو)

خاصیت

جو شخص زوال کے وقت ایک سو بیس بار پڑھا کرے اللہ تعالیٰ اس کو صفائی قلب اور غنا عطا فرمائیں خواہ غناء ظاہری ہو یا غنا باطنی۔

دعاء اللھم انت الملك لا اله الا انت سبحانك انت ربی وانا عبدك ظلمت نفسی و اعترفت بذنبی فاغفرلی ذنبی جمیعاً انه لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لاحسن الا خلاق لایھدی لا حسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت لبیك وسعدیك وانا بك والیك لا منجی منك ولا ملجا الا الیك استغفرك واتوب الیك۔ (ترمذی)

القُدُّوسُ

جل جلالہ

اس اسم کے متعلق چند مسائل ضروری البیان ہیں۔ اول یہ کہ یہ اسم لفظ قدس سے مشتق ہے۔ جس کے معنی طہارت اور نزاہت کے ہیں۔ چنانچہ بیت المقدس کی وجہ تسمیہ بھی اسی مناسبت پر مبنی ہے۔ جنت کو خطیرۃ القدس بولتے ہیں۔ کیونکہ آفات دنیا سے پاک ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدوس کہا گیا ہے کیونکہ تبلیغ وحی میں غلطی اور عیب سے پاک ہیں۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ کلام میں بجز قدوس اور سبوح اور ذروح اور فروح کے سب اسماء فعول بالفتح آئے ہیں۔ مگر یہ چاروں بالضم ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ اصل میں سریانی زبان کا ہے۔ چنانچہ قدیس کا لفظ جو اہل کتاب کی ادعیہ میں وارد ہے۔ اس امر پر کافی حجت ہے۔

اسماء ذات باری میں یہ اسم اس مفہوم پر مشتمل ہے کہ وہ ذات بیچون تمام نقائص و عیوب سے بری ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ القدوس هو المنزه عن كل وصف من اوصاف الكمال الذى يظنه اكثر الخلق كمالا یعنی قدوس وہ ذات ہے جو ان تمام اوصاف کمال سے بری ہو۔ جس کو اکثر

لوگ کمال خیال کیا کرتے ہیں- کیونکہ عوام الناس بلکہ اکثر علماء جو درجہ سیر مقامات تک رسائی نہیں رکھتے- صفات ذات کو انسانی صفات پر قیاس کر لیا کرتے ہیں- مثلاً وہ انسانی علم و قدرت اور سمع و بصر وغیرہ کو ذات باری کے علم و قدرت وغیرہ صفات کے ادراک میں معیار قرار دے لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ذات گرامی جہل سے جو ضد علم ہے اور عجز سے جو ضد قدرت ہے پاک ہے- حالانکہ حق یہ ہے کہ وہ ذات مقدس ان صفات علم و قدرت سے بھی بالاتر ہے-

جن کو ہم انسانی ادراک کی رو سے سمجھ سکتے ہیں لہٰذا عام لوگ ثناء ذات باری میں علیم و قدیر اور سمیع و بصیر سے وہی مفہوم سمجھا کرتے ہیں جو انسان کے صفات کے لئے سمجھنا چاہئے-

بعض مشائخ کرام نے لکھا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو حاجات سے پاک ہو اور جس کی صفات آفات سے بری ہو اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو ابرار صالحین کے نفوس کو آلائش معصیت سے پاک کرتی ہے بعض دیگر اکابر نے لکھا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو احتیاج زمان و مکان سے بالاتر ہو اور بعض حضرات نے یوں تعبیر کی ہے کہ قدوس وہ ذات ہے کہ اپنے اولیاء کے قلوب کو ہر ایک قسم کے مالوفات پر مطمئن ہونے سے پاک کرتا ہے اور انوار مکاشفات سے ان کے ارواح کو انس عطا فرماتا ہے-

اس مقام پر اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ذات باری کے ماسوا تمام موجودات دو قسم پر منقسم ہے اول ذوات دوم صفات پھر ذوات کی دو قسمیں ہیں اول مجردات دوم جسمانیات سو مجردات سب سے اشرف ہیں اور صفات بھی دو قسم کے ہیں عقلی اور حسی ان میں سے عقلی اشرف ہیں کیونکہ وہ دوام و بقار کھتی ہیں- اور حسی متغیر ہوتی رہتی ہیں اس لئے انسان کا تقدس اس امر پر مبنی ہے کہ لذات جسمانیہ سے منہ پھیر لے اور امور مادیہ میں مشتغل ہونے سے کنارہ کش ہو جائے بلکہ واجب یہ ہے کہ علوم حقیقیہ روحانیہ اور اخلاق حمیدہ کے حاصل

کرنے پر اپنی توجہ مبذول کرے اور یہ امر تب حاصل ہو سکتا ہے جب کہ خیر و سعادت کی حقیقت کا اسے پورا پورا علم حاصل ہو-

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ قدوس وہ ذات ہے جس کو ہم تصور اور خیال یا وہم سے ہرگز ادراک نہیں کر سکتے وہ قدوس کے معنی یہ نہیں لیتے کہ وہ ذات جو نقائص و عیوب سے پاک ہو کیونکہ اس ذات گرامی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ نقائص و عیوب سے بری ہے ایک قسم کا سوء ادب ہے مثلاً اگر ہم یوں کہیں کہ بادشاہ ملک جولاہ اور حجام نہیں تو بمقابلہ رتبہ سلطنت یہ طرز بیان بھی ایک قسم کی بے ادبی ہے خاکسار کہتا ہے کہ امام صاحب کا خیال نہایت وزنی اور قیمتی ہے اور اس کو اہل باطن کے سوا کوئی شخص کما حقہ نہیں سمجھ سکتا ادب ہی تمام ترقیات کا زینہ ہے اور بس-

خاصیت

بعد نماز جمعہ کے ایک سو پچاس بار سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح کہہ کر پھر اس کو ایک روٹی پر لکھ کر جو شخص کھاوے تمام آفات سے محفوظ رہے اور توفیق عبادت ہو-

دعاء

سبحان الملک القدوس' سبحان الملک القدوس' سبحان الملک القدوس۔ رب الملئکہ والروح. (حصن حصین)

سبوح قدوس رب الملئکۃ والروح. (حصن حصین)

السّلامُ

جل جلالہ

سلام بمعنی سلامت ہے قال اللہ تعالی وَاللّٰہُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِالسَّلٰمِ اس آیت میں دارالسلام سے جنت مراد ہے کیونکہ جنت میں جانے والا شخص موت اور آفات دنیا سے بچ جائیگا- اسی معنی پر جملہ السلام علیکم کا مفہوم قرار دیا گیا ہے- اللہ تعالیٰ کلام پاک میں یحییٰ علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں وَسَلاَمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیّاً اس آیت کے متعلق سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ ایک عجیب معنے ارشاد فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے لئے تین مواقع سخت وحشت اور تشویش کے ہیں اول جس دن پیدا ہوتا ہے بوجہ ایک غیر معمولی نقل مکانی کے نہایت متوحش ہوتا ہے لہٰذا شیطان ہر ایک بچہ کو پیدا ہونے پر مس کرتا ہے دوم جس دن مرتا ہے اسے ایک عجیب وغریب قوم سے پالا پڑتا ہے یعنی ملائکہ جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا اس لئے وہ اس موقع پر بھی سخت پریشان ہوتا ہے سوم جس دن اس کا حشر ہوگا یہ موقع بھی نہایت اضطراب وسراسیمگی کا ہوگا سو اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کی

نسبت ان ہر سہ مواقع پر آفات سے باسلامت رہنے کا ذکر فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ وہ ان ہر سہ مواقع پر خوف اور ہراس سے محفوظ رکھے گئے ہیں قول صواب کو بھی قرآن مجید میں سلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے حیث قال اللہ تعالی وَاِذَا خَاطَبَہُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلاَماً اس سے معلوم ہوا کہ سلام وہ قول ہے جو عیب اور گناہ سے پاک ہو-

چونکہ مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام بمعنی سلامت ہے اس لئے اسماء ذات باری میں اس کے معنی ذوالسلام کے ہونگے یعنی ایسی ذات جو نقائص سے محفوظ ہو اور بطریق مبالغہ مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں لیا گیا ہے جیسے رجل عدل ای ذو عدل اور رجل غیاث ای ذوغیاث یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سلام اور قدوس میں کیا فرق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قدوس سے زمانہ ماضی اور حال میں بری از عیوب ہونا پایا جاتا ہے اور سلام میں یہ اشارہ ہے کہ زمانہ مستقبل میں وہ محفوظ رہے گا اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ اسم قدوس صفات میں نقص سے بری ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اسم سلام افعال میں نقص سے بری ہونے پر بعض مفسرین نے سلام کے معنی یہ لئے ہیں کہ سلام وہ ذات ہے جو دوسروں کو سلامت بخشے اور یہ امر مبدء و معاد ہر دو کو شامل ہے مبدء کے متعلق تو فرمایا مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی اکثر مخلوقات کو عیوب سے بری پیدا کیا ہے اور معاد کے متعلق فرمایا وَمَا رَبُّکَ بِظَلاَّمٍ لِّلْعَبِیْدِ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ظلم سے باسلامت رکھنے کا وعدہ فرما لیا ہے بعض اہل تحقیق نے سلام بمعنے مسلم لیا ہے یعنی وہ ذات جو قیامت کو اپنے بندوں پر سلام بھیج کر ان کی عزت افزائی کریگی-

(یہ فرق صرف انسانی حالات کے رو سے بتایا گیا ہے- ورنہ ذات باری کی نسبت زمانہ ماضی اور حال اور استقبال یکساں ہیں- کیونکہ وہ ذات اقدس تعلق زمانہ سے بری ہے ۱۲منہ)

قال اللّٰه تعالی تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلَامٌ

حضرات مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس اسم کا مقتضی انسان کامل کے لئے یہ ہے کہ وہ نفس کی ظاہری اور باطنی مخالفت سے محفوظ ہو جاوے قال اللّٰه تعالی وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس اسم کا مقتضے یہ ہے کہ بندہ ذنوب سے محفوظ اور عیوب سے بری ہو جائے قال اللّٰه تعالی اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ اس آیت میں قلب سلیم سے مراد ایسا قلب ہے کہ جو شرک و نفاق سے بالکل خالص اور شک و شقاق سے بالکل فارغ ہو جائے یا یوں کہو کہ قلب سلیم وہ ہے جس کا نفس شہوات اور شبہات سے پاک و صاف ہو جائے الغرض اسلام کا بہرہ اسم سلام سے یہ ہے کہ دنیا میں تو تمام موذی چیزوں سے محفوظ ہو اور اپنی حاجات میں غیر محتاج اور دین میں اس کا باسلامت ہونا یوں ہے کہ مقام شریعت میں بدعت اور شبہات اور ہوا اور شہوات سے بری ہو اور مقام طریقت میں یوں کہ شہوات اور غضب کو قوت عاقلہ کی حکومت سے باہر نہ ہونے دے اور ہر دو کو اپنا مغلوب رکھے اور مقام حقیقت میں یوں کہ غیر اللہ کی طرف اس کو مطلقاً التفات نہ رہے قال اللّٰه تعالی قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ اس اسم کے ذیل میں فرماتے ہیں ولن یوصف بالسلام والاسلام الامن سلم المسلمون من لسانه ویده فکیف یوصف به من لم یسلم هو من نفسه یعنی وصف سلام اور اسلام سے صرف وہی شخص موصوف ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور جس شخص کو ابھی قید نفس سے رہائی نصیب نہیں ہوئی اس کو یہ مقام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

خاصیت

اگر مریض کے پاس اس کے سرہانے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو ایک سو چھتیس بار بلند آواز سے کہ مریض بھی سن لے پڑھیں ان شاء اللہ اس کو شفا ہو۔

اَلْمُؤْمِنُ

جل جلالہ

اس اسم شریف کے متعلق لغوی تحقیق یہ ہے کہ یہ اسم مصدر ایمان سے مشتق ہے جس کے معنی یا تو تصدیق کے ہیں قال اللّٰه تعالی وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ای بمصدق لنا یا امان دینے کے جو خوف دلانے کا ضد ہے قال اللّٰه تعالی وَاٰمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ چنانچہ اکثر محققین نے ایمان کی اصل امان ہی قرار دی ہے ان ہر دو ماخذ کے سمجھ لینے پر اسم مومن کے معنے بھی ہر دو صورت میں تحقیق کرنا ضروری ہے سو جب ہم مومن کو بمعنے مصدق (تصدیق کنندہ) لیں تو اس کی چند وجوہ قرار دی جا سکتی ہیں اول یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات مقدس کی وحدانیت کی بابت دی ہے اس لئے اس کا یہ خبر دینا بمنزلہ تصدیق کے سمجھا گیا اور یہ تصدیق عین ایمان ہے قال اللّٰه تعالی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کئے ہیں اور اظہار معجزہ اللہ تعالیٰ کے صفات افعال میں سے ہے جس کی تصدیق خود اس نے بالفاظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام پاک میں فرما دی

اس لئے یہ تصدیق ذات باری عین ایمان ٹھہری۔

سوم اسم مومن کے بمعنے مصدق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان وعدوں کی تصدیق کریگا جو اس نے اہل ایمان کے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ قال اللّٰہ تعالی۔ جَزَاءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ یہ وعدہ عالم آخرت میں پورا ہو گا اور پھر فرمایا وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یہ وعدہ عالم دنیا میں پورا ہو رہا ہے۔

چہارم اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے متعلق وعدہ فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ چونکہ اللہ تعالیٰ اس وعدہ کی تصدیق فرماتا ہے اس لئے مومن بمعنے مصدق قرار پایا۔

اور اگر اسم مومن کو بمعنی امان دہندہ قرار دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کے مصائب اور عالم آخرت کے عذاب سے امان دینے والا ہے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امان دینے سے مراد خوف کا دور کرنا ہے اور خوف کا دور کرنا تب ہی متصور ہو سکتا ہے جبکہ خوف کا کوئی موقع متوقع ہو اور ایسا موقع کسی قسم کے نقصان یا ہلاکت کے وقت ہو سکتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ نقصان یا ہلاکت کو دور کرنے والا بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں لہٰذا امن دینے والا بھی فی الحقیقت بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا اس کو مثال میں یوں سمجھنا چاہئے کہ نابینا آدمی بوجہ عدم بصارت اپنے ہلاک ہو جانے سے ڈرتا رہتا ہے اور اگر اس کے پاس بصارت ہوتی تو اسے ڈر نہ ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ بصارت نابینا کے حق میں خوف ہلاک کے دور ہو جانے کا ذریعہ تھا اسی طرح لنجا آدمی ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہلاک ہو جانے کا ڈر رکھتا ہے اگر اس کا ہاتھ سالم ہوتا تو خوف ہلاک سے اس کو امان حاصل ہوتی علی ہذا القیاس جمیع حواس اور اعضاء کی نسبت ہم ایسا ہی خیال کر سکتے ہیں چونکہ حواس اور اعضاء کا خالق وہی ذات مقدس ہے اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ اسی ذات مقدس نے یہ اسباب پیدا کر کے ہم کو خوف سے امان دی ہے اسی

طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص دل میں اپنے دشمن سے خوف رکھتا ہے مگر ضعف کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتا اور اگر حرکت کر سکتا ہو تو ممکن ہے کہ کوئی ہتھیار اپنے پاس نہ رکھتا ہو اور اگر ہتھیار بھی اس کے پاس ہو تو ممکن ہے کہ تنہا دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو اور اگر بالفرض اس کے پاس سپاہ کی جمعیت بھی ہو تو پھر بھی اس کو دشمن کے آنے کا خوف دامن گیر ہو گا اس لئے وہ اپنے معاونین کے مشورہ سے قلعہ اور خندق کا انتظام کرنے پر مجبور ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ اپنی کوشش کے مطابق دشمن کے خوف سے امن پا جائیگا لہٰذا وہی ذات مقدس جس نے اسباب مذکورہ بالا کو پیدا کیا ہے امان دہندہ قرار پائے گی اسی طرح بھوک پیاس بیماری کے لئے اس نے اغذیہ اور ادویہ پیدا کر دی ہیں جن سے ہم ہلاکت سے امان پا جاتے ہیں اب عالم آخرت کے متعلق بھی اس ذات کا امان دہندہ ہونا ظاہر ہے کیونکہ بذریعہ دلائل و براہین کے اس نے حقیقت توحید کی وجہ ثبوت پر آگاہ فرما دیا ہے سو جو شخص معرفت توحید حاصل کر لیتا ہے وہ عالم آخرت کے عذاب سے امن میں ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے لا الہ الا اللّٰہ حصنی من دخل حصنی امن من عذابی یعنی توحید میرا قلعہ ہے جو شخص میرے قلعہ میں داخل ہو گا میرے عذاب سے امن پا جائیگا اس تقریر سے معلوم ہوا ہے کہ امن و امان درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں لہٰذا حقیقی مومن وہی ذات مقدس ہے اور بس۔

فائدہ

اگر کوئی شخص یہ اعتراض پیش کرے کہ خوف بھی تو بجز اللہ تعالیٰ کے حقیقۃً کسی غیر کی طرف سے نہیں ہو سکتا پس امن جو خوف کا ضد ہے اس کی طرف سے کیسے ہوگا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا امن دہندہ ہونا ہرگز اس کے خوف دہندہ ہونے کا مانع نہیں کیونکہ وہ معز بھی ہے اور مذل بھی اور محی بھی

ہے اور ممیت بھی اعتبارات علیحدہ علیحدہ ہیں۔

تنبیہ

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ مخلوق خدا کے لئے ہر ایک طرح سے موجب امن و آسائش ہو جاتا ہے خواہ دنیا کے متعلق ہو جیسے کہ کسی مصیبت زدہ کی دستگیری اور امداد خواہ عالم آخرت کی بابت جیسے خلق اللہ کو تبلیغ شریعت کر کے عذاب سے بچانا جو انبیاء علیہم السلام کا فرض ہے اور علمائے امت ان کے وارثان کہلاتے ہیں۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ جو شخص کسی نبی کے نام سے ہمنام ہے جنت میں داخل ہو جائے چنانچہ یہ سنتے ہی ایسے لوگ داخل جنت ہو جائیں گے اور جو لوگ پیچھے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ تم لوگ کون ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم مومنین ہیں مگر ہمارے نام کسی نبی کے نام سے ہمنام نہیں تب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ میں بھی مومن ہوں اور تم بھی مومن ہو جاؤ میری رحمت سے داخل جنت ہو جاؤ۔

خاصیت

جو بکثرت اس کا ذکر کرے اس کو امن اور قوت ایمان ہو اور اگر خوف زدہ ہو۔ اس کو چھتیس بار کہے اپنی جان و مال میں مامون ہو۔

قرآنی آیت

هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغيب والشهادة هو الرحمن الرحيم هو الله الذی لا اله الا هو الملك القدوس السلام المومن المهيمن العزيز الجبار المتكبر سبحن الله عما يشركون هو الله الخالق البارى المصور له الا سمآء الحسنى يسبح له مافى السموات والا رض وهو العزيز الحكيم

المُهَيمِنُ

جل جلالہ

اس اسم کی تفسیر میں دو قول ہیں اول یہ کہ ابو زید بلخی اس لفظ کو غیر عربی قرار دیتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے اہل عرب میں اس کا استعمال نہیں تھا بلکہ یہ سریانی لفظ ہے جس کے آخر میں حرف مدہ ہے یعنی مھیمنا کہہ کر بولتے ہیں جیسا کہ اس زبان کا عام قاعدہ ہے اور اس کے معنی مومن صادق الایمان کے ہیں مگر یہ مذہب صحیح نہیں دوم اہل کلام کا مذہب ہے جو اس کو عربی الاصل مانتے ہیں اور اس کی تفسیر میں چند وجوہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ مھیمن بمعنے شاہد کے ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الكتاب مهيمن لنبينا　　　والحق يعرفه اولو الالباب

اس تفسیر کے رو سے اس اسم کی توجیہ یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال و افعال کا شاہد ہے چنانچہ ارشاد فرمایا كنا عليكم شهوداً سو مھیمن کے یہ معنے ہوئے کہ مھیمن وہ ذات ہے جو تمام معلومات پر حاوی ہو اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے خارج نہ ہو دوم یہ کہ مھیمن دراصل مومن ہے ہمزہ کو ہاء سے بدلا گیا ہے جیسے کہ اکثر الفاظ میں ایسا واقع

ہوا ہے مثلاً هيهات ايهات وهياك واياك سوم خلیل بن احمد کا قول ہے کہ مہیمن بمعنے رقیب و حافظ کے ہے اہل عرب بولا کرتے ہیں هيمن فلان علی كذا اذا كان محافظاً علیہ چہارم مبرد نحوی کہتا ہے کہ عرب لوگ اپنے محاورہ میں بولا کرتے ہیں قدهيمن الطائر یعنی پرندہ نے اپنے آشیانہ کے گرد اپنے بازو اور پر پھر پھرائے- تاکہ اپنے چوزوں پر سے کسی چیز موجب اذیت کو دفع کرے اس لئے اس لفظ کے معنی مشفق دل سوز کے ہوئے پنجم حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مہیمن کے معنی مصدق (تصدیق کنندہ) کے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی بوجہ معجزات کے تصدیق کرتا ہے اس لئے وہ مہیمن ہے ششم امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مہیمن اس ذات کا نام ہے جو مجموع صفات ثلاثہ کی جامع ہو-

(1) علم کامل باحوال شے

(2) قدرت کاملہ کسی شے کے مصالح کی بابت

(3) ان مصالح کا بر طریق دوام جاری رکھنا جس ذات میں یہ ہر سہ صفات موجود ہوں گے وہ مہیمن کہلائے گی سو ایسی ذات صرف ذات باری ہی ہے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مہیمن کتب قدیمہ سماویہ میں ذات باری کا اسم ہے حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ مہیمن وہ ذات ہے جو ظاہر و باطن پر آگاہ ہو اور مخلوق کے شکر و شکایت کو سنے اور بلاؤ مصیبت دفع کرے-

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلب کے خواطر کا پاسبان اور اصلاح حالات کا نگران رہتا ہے جب اسے خود کامل ترقی ہو جاتی ہے تو لوگوں کے ظواہر و باطن پر آگاہ ہو کر ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے-

خاصیت

غسل کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر سو بار رات میں بحضور قلب پڑھیں تو عالی ہمتی پیدا ہو-

العزیز

جل جلالہ

اللہ تعالیٰ نے کتاب کریم میں صفت عزت کو اپنے لئے ثابت کیا ہے قال اللہ تعالیٰ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ اور ابلیس نے رب العزت کی قسم کھاتے ہوئے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ اور اس کے اشتقاق لغوی میں چند وجوہ بیان کیا کرتے ہیں اول جبکہ عزیز کے معنی بے مثل و بے نظیر ہوں تو اس کا اشتقاق عزالشئی یعز سے ہوگا جس کے معنی کسی چیز کے کمیاب ہونے کے ہیں جب کہ اس کی تلاش کی جائے عرب والے بولا کرتے ہیں عزالطعام فی البلد جب کہ سامان معیشت شہر میں نہ مل سکے سو جب مخلوق بوجہ نایاب ہونے کے عزیز کہلا سکتا ہے تو ذات باری جس کا مثل عقلاً محال ہے بدرجہ اولی عزیز کہلانیکی مستحق ہے-

دوم عزیز بمعنی غالب اس صورت میں عزیز سے مشتق ہوگا جس کے معنی غلب یغلب کے ہیں قال اللہ تعالیٰ وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ای غلبنی اہل عرب بولا کرتے ہیں من عزبزای من غلب سلب سو جب ایک عاجز مخلوق اپنے حریف پر غالب آکر عزیز کہلا سکتا ہے تو ذات باری سبحانہ و تعالیٰ جو

کبھی مغلوب نہیں ہوتی بدرجہ اولے عزیز کہلانے کی مستحق ہو گی۔

سوم عزیز بمعنی شدید قوی اس صورت میں عزیز سے مشتق ہو گا جس کے معنی شدید قوی ہونے کے ہیں قال اللہ تعالیٰ فعززنا بثالث یعنی ہم نے تیسرا رسول بھیج کر پہلے دو کو تقویت بخشی سو جب ایک عاجز مخلوق کو بلحاظ اس کی شدت وقوت کے عزیز کہہ سکتے ہیں تو ذات باری جو عجز سے بالاتر ہے بدرجہ اولے عزیز ہو گی۔

چہارم عزیز بمعنے معز جیسے الیم بمعنے مولم اور وجیع بمعنے موجع اس لئے عزیز کے معنی ہوئے عزت دہندہ۔

واضح ہو کہ معنی اول کے رو سے اس اسم سے مفہوم تنزیہ ظاہر ہوتا ہے اور معنی ثانی اور ثالث کے رو سے عزیز منجملہ صفات ذات کے ہو گا اور معنی رابع کے رو سے منجملہ صفات فعل کے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عزیز وہ ذات ہے جس کا مثل کمیاب ہو اور اسی کی طرف بغایت احتیاج ہو اور اس تک رسائی دشوار ہو یہ ہرسہ صفات مجموعی طور پر جب تک کسی موجود میں جمع نہ ہوں عزیز نہیں کہلا سکتا کیونکہ کئی ایک ایسی اشیاء بھی ہوتی ہیں جو کمیاب تو ہوتی ہیں مگر ان کی طرف احتیاج نہیں پڑتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا مثل نہیں ہوتا اور اس کی طرف سخت احتیاج ہوتی ہے مگر اس تک رسائی دشوار ہوتی ہے ایسی شئے کو بھی عزیز نہیں کہہ سکتے مثلاً آفتاب اور جب یہ ہرسہ جمع ہو جائیں تو وہ شے عزیز کہلائے گی اور ان ہرسہ معانی میں کمال و نقصان کا اعتبار جاری ہو سکتا ہے چنانچہ کمیاب ہونے میں کمال یہ ہے کہ کوئی شے صرف ایک ہی ہو اور اسی کا مثل محالات سے ہو اس صفت کا موجود بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں کیونکہ آفتاب کا مثل محال نہیں بلکہ ممکن ہے کیونکہ وہ مخلوق ہے اور کسی چیز کا نافع ہونے میں کمال یہ ہے کہ وہ تمام منافع کی منبع ہو اور یہ وصف بھی بجز ذات باری کے کسی موجود پر صادق نہیں آتی کیونکہ وہ تمام موجودات کا عدم سے وجود میں لانے والا

ہے اور ہر ایک شے اپنے وجود اور صفات اور بقا میں اس کی محتاج ہے اور عدم وصول میں کمال کسی شے کا یہ ہے کہ کسی چیز کو اس پر قدرت پانے کا موقع نہ مل سکے اور وہ خود تمام اشیاء پر قادر ہو اور اس وصف کا موجود بھی بجز ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہر ایک طرح سے انسانی دائرہ عقول سے بالاتر ہے یہیں سے ثابت ہوا کہ عزیز مطلق بجز ذات باری عزاسمہ کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا امام ممدوح کی یہ تشریح واقعی قابل قدر ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ خلقت اس کی طرف حیات اخروی اور سعادت ابدی حاصل کرنے کے لئے محتاج ہوں اور یہ رتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے اور ان کے بعد ان کے قدم بقدم چلنے والے خلفاء راشدین کا اور پھر علماء امت کا بعدہ ان سلاطین کا جو شریعت محمدی کے مطابق سیاست کرتے ہوں۔

فائدہ

اس اسم کی تفسیر میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس قدر کسی شخص کو دین میں درجہ عالی حاصل ہو گا اسی قدر وہ زیادہ قابل عزت ہو گا اور جس قدر وہ عزت دینی سے بہرہ ور ہو گا اسی قدر اس کا مثل کمیاب ہو گا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی عزت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے لئے ہے حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عزت و عظمت کے سامنے بندہ کے نزدیک ہر ایک عزت و عظمت حقیر ہو جائے اور اس کے ذکر کے سوا تمام اذکار دل سے مرتفع ہو جائیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت کا بندہ کو علم ہو جاتا ہے تو تمام مخلوقات نظر سے گر جاتی ہے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے من تواضع لغنی لغناہ ذھب ثلثا دینہ یعنی جو شخص کسی غنی آدمی کی غنا(مالداری) کی وجہ سے اس کی تعظیم کرتا ہے اس کا دو تہائی

دین زائل ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے معرفت بالقلب اقرار باللسان عمل بالارکان موجب زبان اور ہاتھ پاؤں سے تعظیم کسی غنی کی کرے گا تو دو تہائی ایمان زائل ہو جاوے گا اور اگر قلب سے بھی معتقد ہو گا تو سب کا سب زائل ہو جاوے گا بعض علماء نے لکھا ہے کہ عزیز وہ ذات ہے کہ جس کو کوئی طالب نہ پا سکے اور نہ کوئی ہارب اس سے بھاگ کر اپنے تئیں بچا سکے۔

حکایت

کہتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے خلیفہ ہارون رشید کو کسی نیکی کے کرنے کی ہدایت کی خلیفہ سخت ناراض ہوا اور حکم دیا کہ اس کو سرکش اور گستاخ گھوڑے کی دم سے باندھ کر مروا دیا جائے ملازمان شاہی نے فی الفور حکم کی تعمیل کی مگر اس شخص کو کوئی ضرر نہ پہنچا خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کو ایک مکان میں بند کر کے دروازہ کو چن دیا جائے ملازموں نے ایسا ہی کیا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ایک باغ میں ٹہلتا ہوا نظر آیا جب اسے خلیفہ کے پاس لائے تو اس نے سوال کیا کہ تم کو باغ میں کس نے داخل کیا درویش نے جواب دیا کہ جس نے مجھے ایسے تنگ و تاریک گھر سے باہر نکالا خلیفہ یہ سن کر حیران رہ گیا اور حکم دیا کہ اس شخص کو سوار کر کے شہر میں اعلان کر دو کہ ہارون نے اس شخص کو ذلیل کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت بخشی اور ہارون ناکام رہا۔

اس موقع پر اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کئی ایک الفاظ نصوص قرآنیہ میں ایسے واقع ہوئے ہیں جو لفظاً مشترک طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں پر بولے گئے ہیں مگر ان کے معانی میں وہی نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں میں مثلاً قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اس آیت میں عزت کا لفظ اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اور اہل ایمان کی نسبت بولا گیا ہے مگر تینوں کی حقیقت ایک نہیں

اللہ تعالیٰ کی عزت بلحاظ اس کے خالق حقیقی ہونے کے ہے اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بلحاظ آپ کے نبی اللہ ہونے کے ہے اور چونکہ حضور علیہ السلام افضل الانبیاء ہیں اس لئے آپ کی عزت کا مقام بھی تمام انبیاء علیہم السلام سے بالاتر ہے اور اہل ایمان کی عزت بلحاظ ان کے کمال ایمانی کے ہے اور اس لئے اہل ایمان کو وہ کمالات روحانیہ حاصل ہوتے ہیں جو لوازم ایمان ہیں اور چونکہ انسان کامل مظہر صفات ذات باری ہوتا ہے اس لئے اس کی عزت بطور معلول ہونے کے تمام کمالات ذات باری کا نقشہ ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ذات باری خالق ہے انسان بھی بطور معلول خالق ہو سکتا ہے مثلاً مسیح علیہ السلام کی نسبت فرمایا تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ چونکہ انسان کامل بذاتہ خالق نہیں ہو سکتا اس لئے باذنی ارشاد فرمایا تاکہ ایک مخلوق پر خالق حقیقی ہونے کا گمان نہ پیدا ہو اسی طرح ہر ایک فعل کی نسبت بندہ کی طرف ہو سکتی ہے مگر بطور معلول کے نہ بطور علت کے خلاصہ یہ ہے کہ انسان کامل خالق محیی ممیت معزمذل جبار غفار و رحیم سب کچھ ہو سکتا ہے مگر یہ صفات اس کو بذاتہ حاصل نہیں بلکہ بطور انعام ذات باری کے جبکہ وہ مظہر کامل ہو جاتا ہے لہٰذا بعض کوتاہ اندیشوں کا یہ اعتراض کہ کسی نبی یا ولی کو یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی کی امداد کر سکے یا کسی قسم کا فیض روحانی پہنچا سکے بالکل ساقط الاعتبار ہے نبی یا ولی یا یوں کہو۔ کہ انسان کامل محض بطور سبب اسی طرح وسیلہ ہوا کرتے ہیں جس طرح دنیا کے دیگر امور میں اسباب متعارفہ کام دے سکتے ہیں نبی یا ولی جائے خود کچھ نہیں کر سکتے اور انہیں خدائی امور میں کچھ دخل نہیں لیکن ان کا سبب بننا کسی وجہ سے منافی توحید نہیں ہو سکتا اور نہ کسی قسم کی بدعت یا شرک کا موجب ہے تعجب ہے کہ ادویہ کو بطور سبب ازالہ مرض میں وسیلہ مانا جاتا ہے مگر ارواح طیبہ کو خواہ وہ اس زندگی میں ہوں یا عالم برزخ میں اس وصف سے عاری خیال کیا جاتا ہے مسئلہ شفاعت کی حقیقت میں غور کرو تو معلوم ہو گا کہ وہ بجز توسل کے اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا مع ہذا اکابر مشائخ کرام کا بالاتفاق اس امر پر متفق اللفظ

ہونا منکرین کے خیال کو رد کر رہا ہے اور زیادہ حیرت تو اسی امر سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نص آیت یا حدیث اس مسئلہ کے برخلاف نہیں اور جن آیات کو عبادت غیر اللہ کے منع میں پیش کیا جاتا ہے وہ ہرگز اس مسئلہ کی اصلیت کو باطل نہیں کر سکتیں کیونکہ مسئلہ زیر بحث آیات مذکورہ بالا کے عموم مفہوم میں ہرگز داخل نہیں حضرت عمرؓ بن خطاب کا طلب باراں کے لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے متوسل ہونا کافی دلیل ہے جواز استمداد و توسل پر رہا یہ امر کہ بعد از مرگ بھی ایسا جائز ہے یا نہیں سو خصم کو اس کے منع پر کوئی دلیل قائم کرنی چاہیے ہم اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ دلائل سے مضبوط کرتے مگر یہ مقام اس طِوالت کا مقتضی نہیں اور ہمیں یقین ہے کہ منکر جو باب روحانیت سے بالکل ناآشنا ہے ہر ایک حجت کو کسی نہ کسی تاویل باطل سے ٹال دے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسے امور کا اعتقاد زیادہ تر مناسبت فطری پر موقوف ہے جس سے خصم بے بہرہ ہے بااین ہمہ ہمارا یہ خیال بھی قابل وقعت ہے کہ عوام الناس اس استمداد و توسل کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اس لئے انہیں رجوع الی اللہ کی بجائے نبی یا ولی پر اعتماد ہو جاتا ہے اور یہ واقعی ہولناک امر ہے لہٰذا انہیں روکنا ضروری ہے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندوں میں سے عزیز وہ شخص ہے جس کی طرف لوگ سعادت اخروی کے حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں اور ایسے اشخاص قلیل الوجود ہوتے ہیں اور یہ رتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان بزرگواران دین کا ہے جو قدم بقدم انبیاء علیہم السلام کے خلف چلے ہوں مثلاً خلفائے راشدین اور علمائے مجتہدین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

خاصیت

چالیس روز تک ہر روز اکتالیس بار پڑھیں، غناء ظاہری یا باطنی اور عزت نصیب ہو اور کسی مخلوق کا محتاج نہ ہو۔

اَلْجَبَّارُ

جل جلالہ

اس اسم کے متعلق چند وجوہ قابل ذکر ہیں (ا) جبار ایسی بلند چیز کو کہتے ہیں جس تک رسائی ناممکن ہے عرب بولا کرتے ہیں نخلة جبارة (کھجور کا وہ درخت جو بہت اونچا ہو) ناقة جبارة او فرس جبار (مضبوط اور قوی ناقہ یا گھوڑا) قال اللّٰه تعالیٰ اِنَّ فِیۡهَا قَوۡماً جَبَّارِیۡنَ یعنی علماء اس آیت میں جبارین سے وہ لوگ مراد ہیں جو قوم عاد کے بقایا تھے اور سخت سرکشی کیا کرتے رجل جبار (ایسے شخص کو بولتے ہیں جو بڑا متکبر اور غیر متواضع ہو اور کسی کی اطاعت نہ کرے)

ذات باری کے حق میں اس اسم کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو عقول و افکار کی رسائی سے بالاتر ہے عقلاء اور علماء اس کی کنہ ذات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(ب) جبار کے معنی مصلح امور کے ہیں عرب بولتے ہیں جبرت الکسیر یعنی میں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو باندھا جبرت. الفقیر یعنی میں نے فقیر کی حاجت کو پورا کیا دعاء میں بولتے ہیں یا جابر کل کسیر مگر لفظ جابر ذات باری کے

لئے باضافت مستعمل ہوتا ہے اور جبار صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بڑا اصلاح کنندہ عرب کا مشہور شاعر عجاج کہتا ہے۔

قد جبر الدين الا له فجبر

(جبر لازم و متعدی آتا ہے)

یعنی اصلحه فصلح اس لئے صحیح طور پر اصلاح کنندہ بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی امور کی اصلاح اور انتظام اور مشکل کو آسان کرتا ہے اس توجیہ کی رو سے جبار منجملہ صفات افعال کے ہو گا۔

(ج) عرب بولتے ہیں جبره على كذا اذا كرهه یعنی جبر کے معنی کسی کو اپنے حسب ارادہ کسی امر پر مجبور کرنے کے ہیں مثلاً جبر السلطان فلاناً على كذا یعنی بادشاہ نے فلاں شخص کو اپنے ارادہ کے مطابق کسی امر پر مجبور کیا اس لئے ذات باری کے متعلق اس اسم کی توجیہ یہ ہو گی کہ جبار وہ ذات ہے جو اپنے ارادہ پر مخلوقات کو مجبور کرتی ہے خواہ مخلوق اس کو چاہے یا نہ چاہے اور یہی معنی ذات باری کے متعلق صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ سلسلہ کائنات میں بجز اس کے ارادہ کے کوئی چیز موثر نہیں وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے نہ کچھ اور اس معنی کے رو سے بھی جبار منجملہ صفات افعال کے ہے۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جبروت اور تکبر تو مخلوق کے حق میں صفات مذمومہ میں سے سمجھے گئے ہیں ذات باری کے حق میں کیسے محمود ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جباریت کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے جبروت سے بڑے بڑے سرکشوں کو مقہور کرتا ہے اور اپنی عظمت سے ان کو مغلوب کر کے ذلیل بنا دیتا ہے وہ آمر ہے مامور نہیں وہ قاہر ہے مقہور نہیں اس کی وصف ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ یعنی جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی بابت پوچھا نہیں جا سکتا اور مخلوقات کو یہ منصب حاصل نہیں کیونکہ مخلوقات صفات نقص سے موصوف ہے عاجز ہے اور مقہور ایک ناچیز مکھی اور مچھر انہیں تنگ کر سکتے ہیں اور بھوک پیاس کی مصیبت انہیں مغلوب بنا دیتی

ہے اس لئے جبروت و تکبر مخلوق عاجز کی شایان شان نہیں حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو وہم اور فہم سے بالاتر ہو بعض یوں لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو فہم سے بالاتر ہو اور زمانہ اس کا خالق نہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو اشیاء کی اصلاح بلا کسی چارہ جوئی کے کرے اور دوسروں کو طاعت کا حکم دے اور وہ اس حکم میں کچھ احتیاج نہ رکھتا ہو امام غزالی قدس اللہ روحہ لکھتے ہیں کہ بندوں میں سے جبار وہ شخص ہو سکتا ہے جو اتباع کے دائرہ سے نکل کر اس قابل ہو گیا ہو کہ دوسرے لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ حب مال و جاہ کی قید سے رہائی پا گیا ہو کیونکہ مال و جاہ کا محب در حقیقت اللہ تعالیٰ کا طالب نہیں ہو سکتا مگر جو قوی النفس اور عظیم الہمت ہو کر محبت مال و جاہ سے نکل گیا ہو وہ ماسوی اللہ کی طرف کبھی توجہ تک نہیں کرتا دیکھو اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی شان میں ارشاد فرماتا ہے مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی

خاصیت

صبح و شام ۲۱۶ بار پڑھے تو ظالموں کے شر سے محفوظ رہے۔

اَلْمُتَكَبِّرُ

جل جلالہ

اس اسم کی تفسیر امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت اعلیٰ طریق پر لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ متکبر وہ ہے جو اپنی ذات کی نسبت دوسروں کو حقیر جانتا ہو اس لئے وہ عظمت و کبریاء کو اپنا حق سمجھتا ہے اور دوسروں کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس سے ملوک و سلاطین اپنے حواشی اور خدام کو دیکھا کرتے ہیں اگر ایسی نظر نفس الامر پر مبنی ہو تو وصف تکبر اسی کے لئے صحیح ہے اور وہ ذات اس وصف میں محبوب سمجھی جائے گی مگر اس تفسیر کی رو سے کوئی ذات بجز ذات باری کے اس وصف کی مستحق نہیں اور اگر ایسی نظر نفس الامر یا حقیقت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض باطل ہو تو اس ذات کے لئے وصف تکبر صحیح نہیں بلکہ مذموم ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے الکبریاء ردائی والعظمة ازاری من نازعنی واحداً منهما قذفته فی النار یعنی تکبر میری چادر ہے اور بزرگی میرا ازار ہے جو شخص ان ہر دو میں سے کسی کی بابت میرا شریک بننا چاہے گا تو میں اسے جہنم میں جھونک دوں گا اس سے معلوم ہوا کہ تکبر ذات باری کے حق میں تو وصف مدح ہے اور غیر کے حق میں موجب نقص و عیب

مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تکبر مشتق ہے کبریاء سے جس سے مراد بادشاہت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْاَرْضِ اس آیت میں کبریاء سے بادشاہت مراد ہے اس لئے اور کبریاء اور تکبر اسی ذات کا حق ہے جس کی سلطنت بے زوال ہے اور اس میں وہی جاری ہوتا ہے جو چاہتا ہے سو ایسی ذات وہی مقدس ذات باری ہے جو واحد قہار ہے زجاج نحوی کہتے ہیں کہ ذات باری کی صفت متکبر کے یہ معنی ہیں۔ کہ وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے برتر ہے کیونکہ یہ صیغہ تکبر عنہ سے ماخوذ ہے۔

واضح ہو کہ یہ توجیہات محض تکلف باردہ ہیں صحیح وہی معنی ہیں جو امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے فرما دیئے ہیں۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ صیغہ متکبر صرفی وزن کے رو سے باب تفعل کا صیغہ ہے جس کی بناء کسی امر کو تکلف کے ساتھ کرنے پر مبنی ہے یعنی کسی ایسے امر کو کرنا جس کا کرنے والا مستحق نہیں ہوتا اس لئے ذات باری کی نسبت صیغہ متکبر کا استعمال صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہ وصف اس کے لئے ثابت ہے تو تکلف نہ ہو گا اور اگر ثابت نہیں تو اس کی نسبت اس کی طرف درست نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ باب تفعل غیر تکلف کے لئے بھی مستعمل ہے مثلاً تظلم کے معنی اظہار ظلم کے ہیں نہ یہ تکلف ظلم کرنے کے کبھی تظلم کے معنی زیادتی ظلم کے بھی آتے ہیں۔ بعض محققین نے اس کا یہ بھی جواب دیا ہے کہ متکبر کے معنی ہیں الذی یحاول اظهار الکبر ویبالغ فی ذالك الاظهار یعنی متکبر وہ ذات ہے جو اپنی بڑائی کا اظہار کامل طور پر کرے پھر اگر یہ وصف اس میں ثابت ہو گی تو اس کے لئے موجب مدح ہے اور اگر اظہار میں کاذب ہو تو اس کے لئے باعث مذمت سمجھی جائے گی یہ جواب واقعی متین ہے بعض حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ متکبر وہ ذات ہے جو بڑائی اور بادشاہت میں یگانہ اور بزرگی اور غلبہ میں منفرد ہو اور بعض فرماتے ہیں کہ متکبر وہ ذات ہے جس

کے ہاتھ میں احسان ہو اور غفران کا مالک ہو بعض کہتے ہیں کہ متکبر وہ ذات ہے جس کی سلطنت میں زوال اور اس کی عظمت میں تغیر ناممکن ہو۔

انسان کامل کے حق میں متکبر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے بالکل اپنی التفات کو ہٹالے اور ذات حق کو حق کی نیت پر اپنا معبود بنائے نہ کسی دنیوی یا اخروی غرض کے لئے یہ حظ ہے انسان کامل کا اس اسم سے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے بزرگی اور برکت ہو اور شب زفاف میں بی بی کے پاس جاکر قبل مباشرت دس بار ذکر کرے تو اولاد نرینہ نیک بخت ہو۔

اَلْخَالِقُ

جل جلالہ

یہ اسم مصدر خلق سے مشتق ہے جس کے معنی لغت میں ایجاد اور ابداع اور عدم سے وجود کی طرف لانے کے ہیں اور نیز بمعنی تقدیر (اندازہ کردن) کے مستعمل ہے دیکھو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فتبارك الله احسن الخالقين اس آیت میں خلق بمعنی تقدیر ہے کیونکہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ امر ثابت ہے کہ خالق (عدم سے وجود لانے والا) بجز ذات باری کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا اگر ہم اس آیت میں خلق بمعنی تقدیر نہ لیں تو تعدد خالق لازم آئے گا اور پھر ایک دوسری آیت میں فرمایا ان مثل عيسى كمثل ادم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون ظاہر ہے کہ اس آیت میں کن فیکون بمعنی ایجاد و ابداع ہے کیونکہ جملہ خلقه من تراب مقدم واقع ہوا ہے اگر اس میں بھی خلق بمعنی ایجاد و ابداع ہو تو تکرار اور حشو لازم آئے گا لیکن اگر بمعنی تقدیر لیں تو معنی صاف ہو جاتے ہیں کیونکہ فعل تقدیر ایجاد و ابداع سے مقدم ہوا کرتا ہے اور اسی معنی کی تائید ہے آية الا له الخلق والامر میں کیونکہ اس میں بھی امر بمعنی کن فیکون ہے اور آية اذ تخلق من الطين میں

بھی خلق بمعنی تقدیر و تصویر ہے ورنہ بمعنی ایجاد و لبداع صحیح نہیں اہل عرب اپنے محاورہ میں بولتے ہیں خلق الادیم جب کفش دوز جوتا بناتے وقت چمڑہ کو ایک خاص پیانہ پر کاٹتا ہے قال الشاعر

ولانت تفری ما خلقت وبعض القوم یخلق ثم لایفری اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ خلق بمعنے تقدیر مستعمل ہے اور تقدیر کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک مقدار معین پر واقع کرنا۔ (شاعر محمد کو کہتا ہے کہ تو جس چیز کا پہلے اندازہ لگاتا ہے پھر اس کو کاٹتا ہے یعنی اس کی تکمیل کرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ تو لگاتے ہیں مگر کاٹتے نہیں)

اسی طرح خلق بمعنی ایجاد و لبداع مستعمل ہے چنانچہ آیۃ کما بداء نا اول خلق نعیدہ میں خلق بمعنی ایجاد ہی صحیح ہو سکتا ہے اور نیز آیۃ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ میں بھی خلق بمعنی ایجاد مستعمل ہوا ہے کیونکہ بر سبیل انکار وارد کرنا اس امر پر صریح دلیل ہے کہ بجز ذات باری کے کوئی موجود خالق نہیں ہو سکتا آیۃ هو الله الخالق الباری المصور میں غور کرو کہ کس احسن ترتیب کیساتھ اسماء کو منتظم کیا ہے اسم جلالت کو مقدم ذکر کیا اور بعد ازاں خالق۔ باری۔ مصور کو بہ ترتیب ذکر کیا ہے کیونکہ خالق بمعنی مقدر کا مفہوم علم کی طرف رجوع کرتا ہے اور باری کا عدم سے وجود میں لانے کی طرف اور مصور کا عوارض از قسم لون شکل وضع کی طرف ان اسماء اور ان کی ترتیب میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ذات باری ہی مادہ اور عوارض کو عدم سے وجود میں لانے والی ہے اس لئے بعض حکماء کا یہ مذہب کہ مادہ قدیم ہے اور ذات باری صرف متصرف ہے بالکل مردود ہو گیا ان ہر سہ اسماء کی حسن ترتیب کے سمجھنے کے لئے کیفیت خلق انسان میں غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و فہم اور مخاطب مکلّف پیدا کرنا چاہا تو ضروری تھا کہ وہ اپنے علم کامل سے اس کی ترکیب مخصوص اور اعضاء ضروریہ کو مقدر کرتا اور جب یہ مرحلہ پورا ہوا تو اس کو وجود ظاہری میں لانے کے لئے

مادہ معینہ کی ضرورت داعی ہوئی جس سے اجسام وجود پذیر ہوئے اور چونکہ ان اجسام کے لئے صورت اور ہیئت مخصوصہ کی ضرورت تھی جس کو مزاج و قوی کی شکل میں ظاہر کیا اس لئے صورت نوعیہ کو اس کے ساتھ مخصوص کر دیا پس وہ ذات اقدس خالق ہے کیونکہ اسی نے اپنے علم کامل سے اشیاء کو مقدار مخصوصہ مناسبہ میں مقدر کیا اور وہ باری ہے کیونکہ اجسام کو عدم سے وجود میں لایا اور وہ مصور ہے کیونکہ اس نے مزاج اور قوی کی ترکیب کو اجسام سے تعلق دیا اسی کیفیت خلق کے ساتھ عالم کائنات کی ایک ایک چیز پر نگاہ کرو تاکہ تم اس ذات اقدس کے لامتناہی اسرار و حکم کا مشاہدہ کر کے اس کے وحدہ لاشریک اور کامل الصفات ہونے کا یقین حاصل کر سکو۔

خاصیت

سات روز تک متواتر روزانہ سو بار پڑھے تو تمام آفات سے سالم رہے۔

البَارِئُ

جل جلاله

عام طور پر اس اسم کے معنی خالق کے کیا کرتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ خلق بمعنی ایجاد و لبداع کے مستعمل ہے اگر اس اسم کا مفہوم بھی وہی خالق کا مفہوم ہو تو کلام الٰہی میں حشو لازم آئے گا کما مر اور خود ہر دو اسم کی بناوٹ کا علیحدہ علیحدہ ہونا ہر دو کے مفہوم میں کسی امتیاز کو چاہتا ہے علمائے عربیت نے اس اشکال کے رفع کرنے میں مختلف اقوال پیش کیے ہیں چنانچہ ان میں سے تین مشہور قول حسب ذیل ہیں۔

(ا) باری بمعنی موجد و مبدع یقال براً اللّٰہ الخلق (اللہ تعالیٰ نے خلقت کو پیدا کیا) چنانچہ بریۃ خلقت یا موجودات کو بولتے ہیں فعیلۃ بمعنی مفعولۃ ہے اور اس کی اصل مہموز اللام ہے مگر استعمال میں ہمزہ کو حذف کر دیا کرتے ہے ابو عبیدہ ہروی کہتے ہیں کہ اہل عرب پانچ الفاظ میں ہمزہ کو حذف کر کے استعمال میں لاتے ہیں اور وہ الفاظ یہ ہیں بریۃ۔ رویۃ۔ خابیۃ۔ نبوۃ۔ ذریۃ اس تحقیق کے مطابق خالق اور باری میں کچھ فرق نہیں۔

(ب) باری مشتق ہے برویا بری سے اہل زبان بولتے ہیں بروت السہم

وبریت السہم میں نے تیر کو تراشا یا قطع کیا یا درست کیا اس صورت میں باری کے معنی ہوں گے ایسی ذات جس نے بعض اشیاء کو بعض سے جدا کیا بعض اہل عربیت نے اس کو برامن المرض سے مشتق کیا ہے اور نیز اہل عرب بولتے ہیں برء الرجل من امراتہ جب کہ وہ اپنی عورت سے قطع تعلق کر لے اس صورت میں بھی مذکورہ بالا توجیہ صحیح ہو سکتی ہے۔

(ج) باری مشتق ہے بریٰ بروزن رحی سے جس کے معنی خاک کے ہیں لن ورید کا یہی مذہب ہے اہل عرب بولتے ہیں۔ بفیہ التراب یعنی خاکش بدہن اس تعبیر کے مطابق خالق کے معنی ہوں گے وہ ذات جس نے انسان کو عدم سے وجود بخشا اور باری وہ ذات جس نے اس کو خاک سے مرکب کیا قال اللّٰہ تعالیٰ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَ فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ اہل لغت لکھتے ہیں کہ لفظ باری کا استعمال دیگر اشیاء کی نسبت حیوان کے پیدا کرنے کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے چنانچہ براء اللّٰہ الانسان تو صحیح ہے مگر برا اللّٰہ السماء والارض صحیح نہیں یہی وجہ ہے حضرت علی کرم اللہ وجہ قسم کے موقعہ پر اکثر یوں فرمایا کرتے والذی خلق الحبۃ وبراء النسمۃ یعنی اس ذات کی قسم ہے جس نے دانہ کو پھاڑا اور جان کو پیدا کیا اس سے لن ورید کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

لمام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں فھوبا عتبار تقدیر ھذہ الامور و باعتبار الایجاد علی وفق التقدیر خالق وباعتبار مجرد الایجاد و الاخراج من العدم الی الوجود باری والا یجاد المجرد شیی والا یجاد علی وفق التقدیر شیئی اخر یعنی خالق کا مفہوم ایک ایسی ذات ہے جو کسی شئے کے تقدیر معین کے مطابق وجود میں لائے اور باری صرف عدم سے وجود میں لانے والی ذات کو بولتے ہیں۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے صنائع عجیبہ کا ایجاد آسان ہو اور اگر بانجھ عورت سات روز تک روزہ رکھے اور پانی سے افطار کرے اور بعد افطار کے ۲۱ بار پڑھے ان شاء اللہ حمل قرار پاوے اور اولاد ہو۔

اَلْمُصَوِّرُ

جل جلالہ

اسم مصور کے متعلق صرف یہی کافی ہے کہ یہ لفظ صورت سے مشتق ہے جس کی توجیہ میں دو قول ہیں اول یہ کہ صاریصور سے مشتق ہے جس کے معنی امالہ (جھکانے) کے ہیں دوم یہ کہ صاریصیر سے مشتق ہے کچھ ہوا وہ اور صورت دو مفہوم علیحدہ علیحدہ ہیں کیونکہ مادہ سے جسم کا وہ جزء مراد ہے جس سے وہ جسم ممکن الحصول ہوتا ہے اور صورت سے وہ جزء جس سے وہ جسم بالفعل موجود ہو جاتا ہے یعنی صورت کسی شئے کے جز اخیر کا نام ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہرسہ اسماء کی ترتیب میں اس کو اخیر رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے اجسام کو مختلف صورتیں دی ہیں یہ تمام صورتیں صور نوعیہ کہلاتی ہیں انسان کی صورت نوعی تمام اشیاء کی صور نوعیہ سے اشرف واقوم ہے قال اللہ تعالیٰ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ خالق وہ ذات ہے جس نے اشیاء عالم کو بلامشیر پیدا کیا اور بعض نے لکھا ہے کہ خالق وہ ذات ہے جس نے موجودات کو اپنی قدرت کاملہ سے وجود بخشا اور اپنے ارادہ سے ہر ایک چیز کا اندازہ مقرر کیا بعض لکھتے ہیں کہ خالق وہ

ذات ہے جس نے مخلوقات کو بلا سبب و علت پیدا کیا اور ان کو بغیر جلب منفعت اور دفع مضرت کے وجود عطا فرمایا اسم باری کے متعلق حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ وہی ذات اقدس باری ہے تو اس کے قلب پر حوادث کا اثر نہیں ہوتا بعض لکھتے ہیں کہ اس یقین کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عارف کے اپنی قوت و سطوت سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور اپنی عبودیت اور طاعت کو نظر سے ساقط کر دیتا ہے اور اظہار احسان نہیں کرتا اسی طرح اسم مصور کی نسبت یوں فرماتے ہیں کہ مصور وہ ذات ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّاشَآءَ رَکَّبَکَ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظواہر کو صورت حسنہ سے مزین فرمایا ہے اسی طرح بواطن کو سیرت حسنہ سے زینت بخشی ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

انسان کامل کو ان اسماء سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ معرفت حقائق سے قوت نظری کی تکمیل کرتا ہے اور محاسن اخلاق سے قوت عملی کو مکمل بناتا ہے جب انسان ان ہر دو قوت کی تکمیل کر لیتا ہے تب وہ اپنی تلقین سے لوگوں کے عقول میں حق کی تصویر قائم کر دیتا ہے اور یہی اسم مصور کا مقتضے ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے صنائع عجیبہ کا ایجاد آسان ہو اور اگر بانجھ عورت سات روز تک روزہ رکھے اور پانی سے افطار کرے اور بعد افطار کے ۲۱ بار پڑھے ان شاء اللہ حمل قرار پاوے اور اولاد ہو۔

اَلْغَفَّارُ

جل جلالہ

مغفرت مصدر سے ذات باری کے متعلق قرآن مجید میں تین اسم مستعمل ہوئے ہیں غافر غفور غفار بعض محققین نے لکھا ہے کہ بندہ کے لئے بھی معصیت کے قوت و ضعف کے لحاظ سے تین مدارج ہیں ظالم اس صورت میں ذات باری اس کے لئے غافر ہے ظلوم اس جہت سے ذات باری اس کے لئے غفور ہے ظلام اس صورت میں اس کی مغفرت کے لئے ذات باری غفار ہے اور چونکہ بندہ کے صفات متناہی ہیں اور ذات باری کے صفات غیر متناہی اس لئے ضروری ہے کہ غیر متناہی متناہی پر غالب آئے اس بناء پر رحمت کو عذاب پر راجح ظاہر کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ مغفرت کے متعلق بہت سے آیات قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں بعض تو بلفظ ماضی ہیں اور بعض بصیغہ مستقبل اور بعض بصیغہ امر اور بعض بصیغہ مصدر اور ان سب کا مآل ایک ہی ہے۔

یہ لفظ لغت میں بمعنی ستر (پوشیدن) کے مستعمل ہے اسی سے مغفر (خود آہنی) مشتق ہے اسی خیال پر جمہور کا مذہب ہے کہ مغفرت الٰہی سے مراد

ہے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے معاصی کو مستور کر کے انہیں ان معاصی پر مطلع نہ کرنا۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ مغفرت کی یہ تفسیر صحیح نہیں کیونکہ آدم اور موسے اور داؤد انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور ان پر مغفرت کے نازل ہونے کا بھی بیان فرما دیا ہے پھر معصیت کا مستور رکھنا کیسے ہوا؟ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ مغفرت سے عفو و صفح بر سبیل مجاز مراد ہے خاکسار کا خیال ہے کہ جمہور کی رائے کی توجیہ یوں ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کے گناہوں کو مستور فرما دے گا دنیا میں اگر بغرض عبرت اس کا ذکر کر دیا گیا ہے تو یہ امر بجائے خود ایک مصلحت عامہ پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی معصیت کو دنیا میں کبھی تو مستور کر دیتا ہے جیسے دعاء مشہورہ میں وارد ہوا ہے یا من اظہر الجمیل و ستر القبیح اور کبھی بغرض مصلحت ظاہر فرما دیتا ہے مگر عام حالات قبیحہ میں جو انسان کے قلب اور بدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ستر و اخفا فرماتا ہے مثلاً دل کے وساوس اور برے خیالات جن پر بجز عالم الغیب کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا اور بدن کے وہ حصص جن کا ظاہر ہونا موجب قباحت ہے ہمیشہ مستور رہتے ہیں مغفرت آخرت کے متعلق تو صرف ستر و اخفا ہی ہو گا بلکہ خود مغفورلہ سے بھی اس کے معاصی کو مستور کیا جائے گا تاکہ وہ نادم نہ ہو۔

آیۃ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا میں ہر سہ الفاظ عفو مغفرت اور رحمت کی ترتیب میں غور و فکر کرو کہ کس خوبی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں عفو سے مراد ہے گناہوں کا محو کر دینا اور مغفرت سے اشارہ ہے اغیار اور خود اہل معصیت سے گناہوں کے مخفی رکھنے کی طرف کیونکہ جس طرح اطلاع غیر گنہگار کے لئے موجب ندامت ہے اسی طرح گناہ کی یاد بھی اس کے حق میں باعث خجالت ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ لطف و احسان یعنی نعمائے جنت کی بھی استدعا کا حکم دیا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی استدعا کا حکم بندہ کو نہیں دیتا

جس کے پورا کرنے پر وہ راضی نہ ہو آیات مغفرت میں بعض لطائف کا ذکر اکابر کی کلام میں آچکا ہے ہم انہیں ذیل میں بطور اختصار قلمبند کرتے ہیں چنانچہ آیۃ غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب ذی الطول کی تشریح میں مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں اور بعض نے لکھا ہے کہ وہ غافر الذنب ہی بطور اکرام کے اور قابل التوب ہے بطور انعام کے شدید العقاب ہے بطور عدل کے ذی الطول ہے بطور احسان کے اور بعض لکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی تفسیر یوں ہے غافر ذنب المذنبین یعنی گنہگاروں کے گناہ بخشنے والا قابل التوب ای توبۃ التائبین یعنی رجوع کرنے والوں کی توبہ کو قبول فرمانے والا شدید العقاب للکافرین یعنی کفار کو سخت عذاب کرنے والا ذی الطول علی المومنین یعنی اہل ایمان کے حق میں احسان و انعام کرنے والا اور بعض نے ان الفاظ کی یوں تفسیر کی ہے کہ وہ غافر الذنب ہے ظالمین کے لئے اور قابل التوب ہے مقتصدین (معتدلین) کے لئے اور شدید العقاب ہے کافرین کے لئے اور ذی الطول ہے سابقین کے لئے ابوبکر واسطی فرماتے ہیں کہ وہ غافر الذنب ہے اس شخص کے لئے جو لا الہ الا اللہ کہے اور قابل التوب ہے اس شخص کے لئے جو لا الہ الا اللہ کی معرفت پر ثابت قدم رہے اور شدید العقاب ہے اس شخص کے حق میں جو حقیقت لا الہ الا اللہ کا منکر ہو اور ذی الطول ہے اس سعادت مند کے حق میں جو لا الہ الا اللہ کے معارف و اسرار کا مشاہدہ کرے۔

اس آیت شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے چار صفات کا ذکر فرمایا ہے جن میں ہے تین یعنی مغفرت قبول توبہ۔ ذوالطول تو اہل ایمان کے لئے ہیں اور ایک یعنی شدید العقاب کفار کے لئے اور اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے چنانچہ فرمایا سبقت رحمتی غضبی اور نیز اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اہل ایمان کے تین مدارج ہیں۔ ظالم لنفسہ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات اور ان ہر سہ اہل ایمان کے لئے علیحدہ علیحدہ ہر صفات مذکورہ بالا ثابت ہیں۔ مگر کفر کے مختلف اقسام ایک ہی حقیقت انکار پر

مشتمل ہوتے ہیں۔ پس ہر ایک قسم کے کافر کے لئے ایک ہی صفت شدید العقاب کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل جنت کے لئے تین قسم کے پینے کی چیزوں کا ذکر کیا حیث قال اللّٰہ عَیْناً یَّشْرَبُ بِہَا عِبَادَ اللّٰہِ (۲) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتَامُہٗ مِسْکٌ وَّسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ شَرَاباً طَھُوْراً اور کفار کے حق میں فرمایا وَسُقُوْامَاءً حَمِیْماہ

اس نکتہ کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر چہار صفت کے بیان میں صفت شدید العقاب کو صفت مغفرت قبول توبہ کے بعد ذکر فرمایا ہے اشارہ یہ ہے کہ توبہ ہر ایک فرد بشر کے لئے ضروری ہے کیونکہ مشرک کو شرک سے اور کافر کو کفر سے اور مومن فاسق کو فسق سے توبہ کی ضرورت ہے اور مومن جو جرم غفلت یا صغائر کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں غفلت اور صغائر سے توبہ کرنا ضروری ہے اور بصورت توبہ نہ کرنے کے بندہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستوجب ہو جاتا ہے اسی طرح صفت غافر الذنب کو قابل التوب پر مقدم کیا اشارہ یہ ہے کہ مغفرت الٰہی بندہ کے حق میں توبہ سے پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے اور ان ہر دو صفت کو واؤ عاطفہ سے بیان فرمایا فقال غَافِرَ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ اشارہ یہ ہے کہ مغفرت توبہ کے ساتھ مشروط نہیں کیونکہ واؤ عاطفہ معطوف اور معطوف الیہ کی مغایرت کا پتہ دیتی ہے صاحب کشاف اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص کو شراب پینے کی عادت تھی آپ نے یہی آیت لکھ کر اپنے قاصد کے ہاتھ اس کی طرف ارسال کی اور لوگوں سے کہا کہ اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ نصیب کرے اور قاصد کو ہدایت کی کہ جب وہ شخص ہوش کی حالت میں ہو تو اسے یہ رقعہ دینا چنانچہ قاصد اس کے پاس پہنچا اور اس نے رقعہ حوالہ کیا وہ شخص پڑھتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس فرمان واجب الاذعان کا اس کے دل پر ایسا اثر پڑا کہ اسی وقت میخواری سے توبہ کر لی۔

اس آیت کے ذیل میں مناسب نظر آتا ہے کہ آیۃ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً کی تفسیر بھی لکھی جائے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی ہے کہ جب وحشی نے حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احد میں قتل کر ڈالا تو بھاگ کر طائف میں چلا گیا وہاں پہنچ کر اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا اور جناب نبوی میں بدین مضمون ایک عریضہ ارسال کیا کہ آیا میرے لئے توبہ کی گنجائش باقی ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ان اللّٰہ لایغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشاء یعنی اللہ تعالیٰ شرک نہیں بخشے گا اور اس کے سوا باقی جس قدر گناہ ہیں جسے چاہے بخش دے گا وحشی نے دوبارہ عرض کی کہ شاید میرے لئے مشیت الٰہی مغفرت کی مقتضی نہ ہو اور لمن یشاء کا مصداق نہ ہوں تب یہ آیت نازل ہوئی والذین لایدعون مع اللّٰہ الھاً الامن تاب وآمن و عمل عملاً صالحاً یعنی جو شخص توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور اعمال صالح بجا لائے عذاب دوزخ سے محفوظ رہے گا اس پر وحشی نے پھر عرض کی کہ ممکن ہے کہ میرے پاس اعمال صالح بھی نہ ہوں اس پر یہ آیت نازل ہوئی قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعاً اس آیت میں چند امور قابل غور ہیں اول لفظ اسرفوا کے مفہوم میں ہر ایک قسم کا صغیرہ و کبیرہ گناہ داخل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کو کسی خاص گناہ مثلاً زنا شراب خوری کذب غیبت وغیرہ سے مخصوص نہیں کیا مع ھذا مختلف قسم کے گناہ چونکہ خارج از شمار ہیں اس لئے کلام میں بے سود طوالت پیدا ہو جاتی نیز اس سے سامعین کی پردہ دری لازم آتی لہذا اس ذات ارحم الرحمین نے ایک ایسا جامع لفظ رکھ دیا جس سے بڑھ کر اور اس مقام میں موزوں نہیں تھا سو جب وہ ذات اس دنیا میں اپنے بندوں کی پردہ دری جائز نہیں رکھتی تو قیامت کے دن کیسے جائز رکھے گی۔

دوم قاعدہ ہے کہ غلام کا تاوان مولے ادا کیا کرتا ہے پھر مولی یا تو غلام کو بیچ کر تاوان وصول کر لے یا خود متحمل ہو یہاں بیچ ڈالنے کی تو کوئی

صورت نہیں لہذا مولیٰ ہی اپنے ذمہ لے گا یعنی اپنے بندہ کو محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے گا۔

سوم لفظ یا عبادی میں عباد کو اپنی ذات کی طرف اضافت کیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ ذات ارحم الرحمین باوجود بندوں کے مجرم ہونے کے انہیں اپنی طرف نسبت کرنے سے عار نہیں کرتی گو بندے گناہ سے باز نہ آئیں مگر پھر بھی وہ اس کے عاجز بندے ہیں۔

چہارم لفظ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ بندوں کا اسراف یعنی ارتکاب جرم در حقیقت انہیں کے حق میں مضر ہے نہ ذات باری کے حق میں سو ان کے لئے یہی ضرر کافی ہے اس لئے دوسری مصیبت یعنی عذاب ان پر عائد نہیں کیا گیا۔

پنجم صیغہ لا تقنطوا سے صریح طور پر نہی فرمائی اور نہ صرف نہی فرمائی بلکہ اس نہی کی مخالفت کرنے والے کے حق میں وعید بھی کی حیث قال اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کفار ہی ناامید ہو سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ امید رحمت کو منقطع کر دینا بھی منجملہ علامات کفر کے شمار کیا گیا ہے۔

ششم اس آیت میں لفظ جمیعاً سے بجز شرک کے ہر ایک قسم کے گناہ کی مغفرت کا وعدہ ہے اور یہی صحیح مذہب بھی ہے بعض مفسرین نے اس مغفرت کو توبہ سے مشروط قرار دیا ہے مگر حق یہ ہے کہ مغفرت مومن کے لئے ہرگز مشروط بہ توبہ نہیں چنانچہ آثار صحیحہ میں اس کی پوری پوری تائید موجود ہے۔

ہفتم آیت کے اخیر پر فرمایا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ یہ جملہ گذشتہ مضمون کے لئے بمنزلہ دلیل کے ہے جس کی صورت یوں ہے کہ مغفرت و رحمت کچھ تمہارے لئے مشروع نہیں ہوئی بلکہ یہ تو اس ذات مقدس کا قانون ہے اور جملہ اسمیہ اور حرف تحقیق اور ضمیر مرفوع منفصل کا لانا اس مضمون کو اور بھی موکد کرتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں آیۃ نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ بھی قابل غور ہے اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ چند صحابہ آپس میں بیٹھے ہنس رہے تھے حضور علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تم لوگ ہنس رہے ہو حالانکہ تمہارے سامنے آتش و دوزخ ایک مرحلہ آنے والا ہے۔ یہ لوگ اس بات کو سن کر سخت محزون اور ملول ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لائے اور فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے ہیں اور بارگاہ رب العزت سے مذکورہ بالا آیات لائے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ بیشک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اس آیت میں چند نکات قابل بیان ہیں۔

(۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ قرآن مجید کے حروف کی تعداد تین لاکھ پچیس ہزار المعتبر ہے اگر امت محمدیہ کے لئے قرآن مجید میں سوا حرف یا کے جو عبادی کا مضاف الیہ ہے اور کوئی بشارت نہ ہوتی تو ان کے لئے کافی تھی کیونکہ جس طرح لفظ عبادی کے حرف دال اور حرف یا میں کچھ فاصلہ نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے گنہگار بندوں کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

(۲) لفظ نبی سے جناب نبوی کو خطاب کیا گیا ہے اور یاء متکلم سے خود ذات باری عزاسمہ مراد ہے اور ہر دو کے درمیان لفظ عباد واقع ہوا ہے جس سے عاصیان امت محمدیہ مراد ہیں اشارہ یہ ہے کہ گنہگار ان امت کے آگے آگے تیری شفاعت ہے اور ہماری رحمت ان کے پیچھے پیچھے اور وہ ہر دو کے درمیان ہیں سو کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی قسم کا صدمہ یا ضرر پہنچے۔

(۳) بندگان گنہگار کا اپنے مولیٰ کی طرف منسوب ہونا ان کے لئے موجب فخر و مباہات ہے اور یہی نسبت ان کے لئے کافی ہے کہ وہ اس کے بندے ہیں خلیفہ مامون کی نسبت مروی ہے کہ ایک دفعہ اس کا پوتا اور دوہتا اس کے پاس موجود تھے خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ تم اپنا اپنا نسب بیان کرو پوتے نے اپنا نسب

بیان کیا اور دوہتے نے اپنا خلیفہ نے پوتے کا منہ جواہرات سے پر کیا اور دوہتے کے منہ میں شکر بھر دی اور فرمایا کہ پوتا ہماری طرف منسوب ہے اور دوہتا اغیار کی طرف سو جب سلاطین دنیا کی طرف منسوب ہونا موجب امتیاز ہے تو اس سلطان السلاطین کی طرف منسوب ہونا بھلا کیوں موجب عزت و افتخار نہ ہو گا اور یہی نسبت استحقاق رحمت کے لئے علت ہے۔

(۴) اس آیت میں یہ نکتہ نہایت قابل غور ہے کہ جملہ اِنِّیٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ میں تکریر ضمیر متکلم نے جملہ کو کس طرح موکد بنا دیا ہے اس کی مثال خود قرآن مجید میں موجود ہے انی انا ربک میں اس تکریر ضمیر سے موسیٰ علیہ السلام کے خوف اور وحشت کو دور کیا اور انی انا اخوک میں یوسف علیہ السلام کے بھائی کی وحشت کو انس کے ساتھ بدل دیا جس کی تقریر یوں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو دستر خوان پر بٹھایا تو سب بھائی دو دو ہو کر بیٹھ گئے اور بنیامین (جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے) اکیلے رہ گئے اور انہیں یوسف کی یاد سے دل پر سخت چوٹ لگی اور رونا شروع کیا یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ تم کیوں روتے ہو بنیامین نے کہا کہ میرا بھی ماں جایا حقیقی بھائی تھا اگر آج ہوتا تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھتا۔ یوسف علیہ السلام نے اس کی اس حالت زار کو دیکھ کر کہا اِنِّیٓ اَنَا اَخُوْکَ یعنی تم غم مت کرو میں تمہارا بھائی ہوں اس جملہ سے بنیامین کے دل کو تسلی اور اطمینان حاصل ہوا اور اس کی وحشت انس سے مبدل ہو گئی یہی صورت اس آیت میں متحقق ہے جب بندہ گنہگار اپنے گناہوں کو دیکھ کر حسرت و یاس میں مبتلا ہوتا ہے اس ارحم الراحمین کا وعدہ اِنِّیٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اس کی وحشت کو انس سے بدل دیتا ہے اور اس کو پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسماء غافر غفور غفار میں بلحاظ معنی کے بہت تفاوت ہے یعنی غفور بہ نسبت غافر کی اور غفار بہ نسبت غفور کی بدرجہ کمال مغفرت کے مفہوم پر مشتمل ہے بعض حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ وہ ذات

مقدس غافر ہے کیونکہ نامہ اعمال سے معصیت کو دور کر دیتا ہے اور وہ غفور ہے کیونکہ ملائکہ جو کاتبان اعمال سے بندہ کے گناہ فراموش کرا دیتا ہے اور وہ غفار ہے کیونکہ بندہ کو بھی اس کے معاصی مطلقاً فراموش کرا کے ایسا بنا دیتا ہے کہ اس کو اپنے گناہوں کا علم ہی نہیں رہتا کیونکہ باوجود مغفرت کے اگر گناہ کی یاد باقی رہے تو یہ بات بھی ناخوش معلوم ہوتی ہے اور طبیعت میں ندامت پیدا ہو کر مسرت کو مکدر بنا دیتی ہے بعض نے لکھا ہے کہ وہ ذات اقدس غافر فی الدنیا اور غفور فی القبر اور غفار فی یوم الحساب ہے بعض نے فرمایا ہے کہ جس کا ایمان علم الیقین کے درجہ پر ہو اس کے حق میں غافر ہے اور جس کا ایمان عین الیقین کے رتبہ پر ہو اس کے حق میں غفور ہے اور جس کا ایمان حق الیقین کے مقام پر ہو اس کے لئے غفار ہے۔

انسان کامل کا بہرہ اس اسم سے یہ ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب اور مقابح پر اسی طرح پردہ پوشی کرتا ہے قال علیہ الصلوٰۃ والسلام من ستر علی مومن عورته ستر اللّٰہ علیه عورته یوم القیامة جو شخص کسی مومن کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈال دے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی شخص کمال و نقصان اور صواب و خطا سے خالی نہیں سو جو شخص کسی کی برائیوں سے اغماض کر کے اس کی خوبیوں کا ذکر کرے وہ اس اسم سے کامل بہرہ رکھتا ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک مرے ہوئے کتے کی لاش پر گذرے ساتھیوں نے کہا کہ کیسی ناگوار بو آ رہی ہے آپ نے فرمایا کہ اس کتے کے دانتوں کی سفیدی کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے گویا آپ نے ان لوگوں کو نہایت عمدہ طریق سے یہ تعلیم فرمائی کہ کسی کے عیب کو نظر انداز کر کے اس کی خوبی کو دیکھنا چاہیے۔

خاصیت

بعد نماز جمعہ سو بار پڑھے تو آثار مغفرت پیدا ہوں یعنی ہر تنگی دفع ہو بے گمان رزق ملے

اَلْقَھَّارُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ اور نیز فرمایا لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ یہ اسم مصدر قہر سے مشتق ہے جس کے معنی غلبہ کے ہیں اور نیز کسی چیز کو اس کے اقتضاء طبع سے بر سبیل جبر روکنے کے ہیں اور قہار مبالغہ کا صیغہ ہے جس سے کثرت قہر کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے علماء نے اس کی توجیہ میں مختلف اقوال بیان کئے ہیں بعض لکھتے ہیں کہ قہر ایک خاص وصف پر قدرت رکھنے کا نام ہے جس طرح رحمت ایک وصف مخصوص کے ارادہ کو کہتے ہیں قاہر اس شخص کو بولتے ہیں جو کسی دوسری چیز کو کسی امر سے روک کر اس کے برخلاف پہلو پر چلا سکے اس توجیہ کے رو سے یہ اسم منجملہ صفات ذات کے سمجھا جائے گا اور بعض لکھتے ہیں کہ قہار اس ذات کو بولتے ہیں جو غیر کو اس کے ارادہ کے مطابق جاری ہونے سے روک سکے اس صورت میں یہ اسم منجملہ صفات فعل کے ہوگا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ قہر ذات باری کی مختلف صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ تمام موجودات ممکن حادث ہیں اگر اللہ تعالیٰ کے دائرہ قہر

سے باہر ہو جائے تو کوئی چیز دائرہ وجود میں قائم نہ رہ سکے جس کا مطلب یہ ہے کہ عدم اور وجود ہر دو تابع قہر الٰہی ہیں جس سے ممکنات کے عدم کو وجود سے بدل دیا ہے اور اس کی حکمت کاملہ کے مطابق بوجہ اس کے قاہر ہونے کے عدم ان پر طاری نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قہر نے اس کو روک رکھا ہے۔

دوم یہ کہ بموجب تحقیق اہل ہیئت ثابت ہو چکا ہے کہ شمس و قمر اور اکثر سیارے کرہ ارض سے کئی گنا بڑی جسامت رکھتے ہیں اور افلاک کی جسامت کا تو اندازہ کون کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صفت قہر نے ان سب کو بلا کسی سہارے کے اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہوا ہے اور وہ ہرگز اپنے مرکزوں سے ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو بلا کسی سہارے کے ان کی جگہ پر قائم رکھا ہے کیا مجال ہے کہ وہ اپنے مرکزوں سے ادھر ادھر ہو جائیں۔

سوم یہ کہ تمام مادی جسم عناصر اربعہ کی ترکیب سے بنتے ہیں اور عناصر اربعہ اپنی اپنی طبعی خاصیت کی وجہ سے امتزاج اور ترکیب کے مقتضی نہیں مگر اس کی قدرت کاملہ نے ان کو ایسا امتزاج بخشا ہے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے سب اس کی صفت قہر کا نتیجہ ہے۔

چہارم یہ کہ روح ایک لطیفہ نورانیہ ہے جو مادہ اور لوازم مادہ سے بالکل بری ہے مگر غور کرو کہ اس کی قدرت کاملہ نے کس طرح اس ہیکل عنصری کے ساتھ اس کو تعلق بخشا ہے جو بالکل ظلمانی اور کثیف ہے مگر اس کی صفت قہر ان ہر دو کے تعلق کو زائل نہیں ہونے دیتی۔

پنجم یہ کہ دنیا میں کس قدر عظیم الشان اور جبار و متکبر سلاطین و ملوک گذرے ہیں مگر اس کی صفت قہرا نہیں امراض موت وغیرہ حوادث سے کس طرح مغلوب اور عاجز بنا دیتی ہے اور وہ باوجودیکہ ہزاروں تدابیر اور کوششیں ان حوادث کو روکنے کے لئے عمل میں لاتے ہیں مگر کچھ پیش نہیں چلتی یہیں سے

اس کی قہاریت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

ششم عقول بشری تحقیق اشیا میں کس قدر باریک بین ہیں مگر اس ذات اقدس کی حقیقت کے ادراک میں عاجز محض ہیں اور اس کے انوار جلال و جبروت کے احاطہ کرنے سے نگاہیں خیرہ ہیں اور یہی اس کی صفت قہر کا ثبوت ہے۔

ہفتم ہم چشم بصیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ تمام ذات کائنات اس ذات اقدس کی مشیت کے تابع ہیں اور خود انسان ہزارہا امور میں اپنے ارادہ کے برخلاف ناکام رہتا ہے الغرض کوئی چیز اس ذات بیچگون کے ارادہ سے باہر نہیں جا سکتی نہ وجوداً نہ عدماً قال اللہ تعالیٰ وَمَا تَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَن يَّشَاءَ اللّٰهُ پھر فرمایا وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ وہ ذات اقدس قاہر ہے اس لئے کہ نفوس عابدین پر غالب آکر ان کو اپنی طاعت پر محدود رکھتی ہے اور وہ قہار ہے اس لئے کہ قلوب طالبین پر غالب آکر ان کو اپنا انیس بناتی ہے اور لطف مشاہدہ جمال سے عزت بخشتی ہے۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ قہار وہ ذات ہے جو اپنے بندوں سے بشریت کے آثار اور رسوم کے مٹا دینے اور علم و عزت کے کھو دینے کی طالب ہو بعض نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ قہار وہ ذات ہے جس کی صولت و حشمت کے سامنے کسی کی صولت و حشمت کا ظہور نہ ہو بلکہ اس کے سامنے محو ہو جائیں اور جس کی سطوت کے سامنے تمام مخلوق عاجز ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ یعنی قیامت کے دن جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے وصف قہاریت کا اظہار فرماوے گا تو اہل محشر کو جہاں گروہا گروہ خلائق جمع ہو گی یہ آواز سنائی جائے گی کہ آج کے دن سلطنت کا مالک کون ہے؟ چونکہ تمام مخلوق اپنے اپنے حال بد میں مبتلا ہو گی اس لئے کسی کو وہاں دم مارنے کی مجال نہیں ہو گی تب خود ہی دوسری آواز سنائیں گے کہ آج بڑے بڑے مدعیان کے تمام دعاوی خاک میں مل گئے اور وہی حقیقی مالک الملک آج کے دن کی سلطنت کا مالک

ہے جو اپنے کمال صفات میں یگانہ اور سب اشیاء پر غالب آنے والا ہے بتلاؤ آج بڑے بڑے جبارین کہاں ہیں سلاطین نامدار اور ملوک کامگار کو کیا ہوا؟ اور انبیاء و مرسلین کس حال میں ہیں؟ اور کفار و مشرکین اور فساق ملحدین کیوں اپنے تئیں ظاہر نہیں کرتے؟ ایک بے نیازی کا عالم ہو گا جہاں انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین اور ارواح و اجسام سب کے سب بے حقیقت ہو جائیں گے اور صرف ایک ذات اقدس جو تمام کمالات کی جامع ہے اپنی بے نیازی کے ساتھ تمام موجوات محشر پر جلوہ افروز ہو گی اور بس۔

عبد کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام اعداء پر غالب آتا ہے چونکہ سب سے بڑھ کر دشمن' انسان کا اپنا نفس ہے اس لئے جو شخص شہوت و غضب اور حرص و وہم و خیال پر غلبہ پا لیتا ہے وہ در حقیقت تمام اعدا کو مغلوب کر لیتا ہے اور کسی غیر کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہیں مل سکتا رہا یہ امر کہ غضب و شہوت وغیرہ پر انسان کیونکر غالب آسکتا ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر کبھی تو بذریعہ مجاہدات و ریاضت کے حاصل ہوتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور کبھی بذریعہ جذبات حق کے چنانچہ بعض آثار میں حضور علیہ السلام سے مروی ہے جذبة من جذبات الحق توازی عمل الثقلین یعنی ایک جذبہ منجملہ جذبات حق کے جن و انس کے عمل کے برابر درجہ رکھتا ہے مگر یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ازلی پر موقوف ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے دنیا کی محبت اور ماسوی اللہ کی عظمت دل سے جاتی رہے اور دشمنوں پر غلبہ ہو اور اگر چینی کے برتن پر لکھ کر ایسے شخص کو پلایا جاوے جو بوجہ سحر کے عورت پر قادر نہ ہو سحر دفع ہو۔

قرآنی آیت لا الہ الا اللہ الواحد القہار رب السموت والارض وما بینھما العزیز الغفار (حصن حصین)

الوَهَّابُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ یہ اسم مصدر وھب یھب ھبۃ سے مشتق ہے اور ہبہ کسی شخص کو کسی چیز کے بلا معاوضہ مالک کر دینے کو کہتے ہیں اور ہبہ حقیقۃ بجز ذات باری کے کوئی غیر نہیں کر سکتا کیونکہ ہبہ میں دو رکن ضروری ہیں اول کسی چیز کا مالک بنا دینا دوم بلا معاوضہ مالک بناتا سو یہ امر بندگان عاجز سے نا ممکن ہے کیونکہ (۱) جب تک اللہ تعالیٰ بندہ کے دل میں کسی امر کے بجا لانے کا ارادہ اور نیت مستحکم پیدا نہ کرے بندہ خود بخود کچھ نہیں کر سکتا اس لئے حقیقی فاعل وہی ذات اقدس ہو گی (۲) عاجز بندہ تو اپنے افعال کی حقیقت کے سمجھنے سے بھی عاجز ہے اس لئے وہ اپنے افعال کا خود موجد نہیں ہو سکتا بلکہ موجد در حقیقت ذات باری ہے اس لئے واہب در حقیقت بھی وہی ذات اقدس ہے (۳) اگر اللہ تعالیٰ ازل میں بندہ کے عمل ہبہ کو مقدر نہ کرتا تو بندہ اس عمل کو کبھی بجا نہ لا سکتا کیونکہ اس کے علم و ارادہ کے بدوں کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا اس لئے فی الحقیقت وہی ذات جامع کمالات واہب ہو گی نہ کوئی اور (۴) عاجز بندہ تو اللہ تعالیٰ کا مملوک ہے مملوک خود کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔ قال اللّٰہ

تعالیٰ ضَرَبَ اللّٰهُ عَبْداً مَّمْلُوْكاً لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ اور جب بندہ خود کسی چیز کا مالک نہیں تو وہ کسی غیر کو کیونکر کسی چیز کا مالک بنا سکتا ہے؟

اب رہا دوسرا رکن سو یہ مسلم ہے کہ عاجز بندہ کبھی کوئی عمل بلا کسی معاوضہ دنیوی یا اخروی کے بجا نہیں لاتا دنیوی معاوضہ میں ہر ایک قسم کا معاوضہ شامل ہے خواہ مدح و آفرین ہیں سننا مقصود ہو اور اگر معاوضہ کا خیال انسان کے دل میں نہ ہوتا تو اس سے کبھی کوئی عمل بھی صادر نہ ہو سکتا حتی کہ عارفان خدا کے اعمال بھی معاوضہ رضائے خدا ہونے پر مبنی ہیں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہبہ کے ہر دو رکن عاجز بندہ سے صادر نہیں ہو سکتے تو وہ عمل ہبہ کا حقیقۃ عامل نہیں کہلا سکتا مگر ذات باری کی نسبت ہبہ کے ہر دو رکن صحیح طور پر ثابت ہیں۔

(۱) تملیک تو اس لئے کہ وہ خود تمام اشیاء کا خالق و مالک ہے اس لئے دوسروں کو کسی شئے کا مالک بنا سکتا ہے۔

(۲) اور بلا معاوضہ اس لئے کہ اس کی ذات ہر ایک چیز سے مستغنی ہے کمی اور بیشی کو اس کی ذات سے کچھ تعلق نہیں لہذا ہبہ در حقیقت اسی ذات بے نیاز کا فعل ہو سکتا ہے نہ کسی غیر کا اور اگر مجازاً انسان کو بعض اشیاء کا واہب مان بھی لیں تو پھر بھی اس کا عمل ہبہ محدود بلکہ نہایت ہی مختصر ہو گا اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا بیمار کو شفا دینا بے فرزند کو فرزند عطا فرمانا گمراہ کو مہتدی بنانا وغیرہ ایسے امور ہیں جو بجز اس واہب حقیقی کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا بلکہ اس ذات اقدس کے عطایا اس قدر وسیع ہیں کہ کوئی شخص ان کا احاطہ نہیں کر سکتا قال اللّٰہ تعالیٰ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی حصر نہیں کر سکتے اور پھر فرمایا وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ یعنی جو نعمتیں تمہیں حاصل ہیں سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان ہر دو آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ منعم حقیقی وہی ذات ہے اور یہ کہ ہم اس کی نعمتوں کا حصر کرنے سے عاجز ہیں۔

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ وہاب وہ ذات ہے جس کی عطا اور جود کی کوئی حد نہ ہو اور بلا سوال انعام کرے اور کسی حال میں کسی کو اپنی نعمت سے محروم نہ رکھے بعض لکھتے ہیں کہ وہاب وہ ذات ہے جو بلا وسیلہ انعام کرے اور بلا سبب وحیلہ عطا فرما دے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دیتا ہے اور تمام حالات میں اپنے مولیٰ کی خدمت پر محدود رہتا ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے غنا اور قبولیت اور ہیبت و بزرگی پیدا ہو اگر چاشت کے نفلوں کے آخری سجدہ میں اس کو چودہ بار کہے یہ مقاصد اس کو حاصل ہوں۔

دعاء

لا آله الا انت لا شريك لك سبحانك اللهم انى استغفرك لذنبى واسالك رحمتك اللهم زدنى علماً ولا تزغ قلبى بعد اذ هديتنى وهب لى من لدنك رحمة انك انت الوهاب۔ (حصن حصين)

اَلرَّزَّاقُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ داؤد علیہ السلام کی ایک دعاء میں یوں مروی یا رازق البغاث فی عشہ یعنی اے ناتواں جانوروں کو ان کے آشیانہ میں روزی پہنچانے والے اس جملہ کی توجیہ جس میں بعض اہل تحقیق نے یوں لکھا ہے کہ کوا جب اپنے انڈوں کو توڑ کر بچے نکالتا ہے تو بچہ کی رنگت سفید ہوتی ہے جس سے کوا کراہت کرتا ہے اور بچہ کو یوں ہی چھوڑ کر اڑ جاتا ہے مچھر اور مکھیاں اس کے بدن پر آکر بیٹھتی ہیں۔ اور انہیں کو وہ اپنی غذا بناتا ہے رفتہ رفتہ جب اس کے پر و بال نکل آتے ہیں اور سیاہ نظر آنے لگتے ہیں تب کوا بھی آموجود ہو جاتا ہے اور اس سے انس پکڑتا اور اس کی تربیت کرتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح جسم انسانی بذریعہ مادی اشیاء کے جو غذا کی صورت میں ہوتی ہیں تربیت پاتا ہے اسی طرح روح انسانی معارف و اسرار سے تربیت حاصل کرتی ہے اور ہر دو کو رزق کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر رزق روحانی یعنی معارف حقہ انسان کے لئے بہترین رزق سمجھا گیا ہے کیونکہ ان سے روح انسانی قوت پاتی ہے یہ امر مسلم ہے کہ معارف و

اسرار حقہ کے انکشاف کا سب سے اعلیٰ ذریعہ نماز ہے اس لئے روحانی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ نماز پنج گانہ مع شروط وآداب مواظبت کی جائے نماز جس طرح روحانی انکشافات کا ذریعہ ہے اسی طرح جسمانی غذا یعنی روزی کی وسعت کا اعلیٰ ذریعہ بھی ہے دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر مداومت کرو ہم تمہاری روزی کے متکفل ہیں حضرات اہل باطن لکھتے ہیں کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنی تمام حاجات میں اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرے دیکھو جب موسیٰ علیہ السلام نے طلب دیدار کی جو ایک اہم مطلوب اور اعلیٰ مقام تھا تو رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ کہ بارگاہ رب العزت میں التجاء کی اور جب بھوک لگی تو طلب طعام کے لئے جو ایک ادنیٰ اور اخس امر ہے بالفاظ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ اسی بارگاہ معلیٰ کی طرف رجوع کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری روزی کو تمہاری طلب میں لگا دیا ہے اور تمہیں طلب جنت کا حکم دیا ہے مگر تمہارا حال اس کے برعکس ہے کیونکہ تم روزی کو طلب کرتے پھرتے ہو اور طلب جنت کو بھلائے بیٹھے ہو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض ارشادات میں یوں وارد ہوا ہے کہ تم اپنے پیٹ کی فکر میں مت کڑھو پرندوں کی طرف دیکھو کہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو اپنے آشیانہ میں سیر ہو کر واپس آتے ہیں اور وہ تمہاری طرح نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ ہم پرندوں کی نسبت بڑے پیٹ رکھتے ہیں تو جنگل کے وحشیوں کی حالت میں غور کرو کہ تم سے زیادہ پر خوار ہیں اور وہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہیں ان کی روزی پہنچا دیتا ہے۔

اسم رزاق کی توجیہ میں مختلف اقوال ہیں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ رزاق وہ ذات ہے جو ابدان کو توفیق کی غذا دیتا ہے اور ارواح کو تصدیق کی نعمت عطا فرماتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اغنیاء کو تو وجود رزق کے ساتھ

مخصوص کرتا ہے اور فقراء کو شہود و رزاق کا درجہ عطا فرماتا ہے یعنی اغنیاء کی نظر نعمت پر ہوتی ہے اور اولیاء کی منعم پر بعض لکھتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اشباح (اجسام) کو فوائد لطف اور ارواح کو عوائد کشف سے عزت بخشتا ہے بعض یوں کہتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے قناعت عطا فرما کر اسے وجہ معاش کے اسباب سے روک دیتا ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ملتا ہے کہ وہ رزاق حقیقی کے مقدر پر راضی رہتا ہے اور جو کچھ پاتا ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ کما امر اللہ بہ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا اور وہ چشم بصیرت سے وصف رزاقیت کو دیکھ لیتا ہے اور اس لئے کسی غیر سے روزی کا منتظر نہیں رہتا چنانچہ حاتم اصم رحمہ اللہ کی نسبت مروی ہے کسی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے کھایا کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ سے اس شخص نے کہا کیا آسمان پر سے روٹی تم پر گرائی جاتی ہے آپ نے جواب دیا کہ ایسا تب ہوتا جبکہ زمین پر اس کے خزائن موجود نہ ہوتے اس شخص نے کہا کہ تم لوگ الفاظ کی تاویل کر لیتے ہو آپ نے فرمایا ہاں اس لئے کہ آسمان پر سے کلام ہی نازل ہوا ہے اس شخص نے کہا کہ میں آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا آپ نے فرمایا کہ واقعی باطل حق کے سامنے عاجز ہے۔

خاصیت

قبل نماز فجر گھر کے سب گوشوں میں دس دس بار کہے اور جو گوشہ سمت قبلہ داہنی طرف ہو اس سے شروع کرے تو وسعت رزق حاصل ہو۔

الفتاح

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡفَاتِحِيۡنَ اور پھر فرمایا وَهُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِيۡمُ یہ اسم مصدر فتح سے مشتق ہیں جس کے معنی لغت میں دروازہ کھولنے کے ہیں چنانچہ قفل کی چابی کو مفتاح کہتے ہیں قال اللہ تعالیٰ فَفَتَحۡنَا اَبۡوَابَ السَّمَاءِ اور لڑائی میں فتح پانے سے مراد ظفریاب ہونا لیا کرتے ہیں قال اللہ تعالیٰ اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا اس آیت میں فتح سے فتح مکہ مراد ہے ممکن ہے کہ فتح سے ظفر مراد لینا اس خیال پر مبنی ہو کہ عموماً دشمن پر کامیاب ہونے کا یہ معیار تھا کہ فاتح کی سپاہ قلعہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتی تھی اور جب یہ صورت ہوا کرتی تو سمجھ لیا جاتا کہ دشمن مغلوب ہو گیا۔

اس اسم کی توجیہ دو طرح کی گئی ہے اول تو یہ کہ فتاح وہ ذات ہے جو اپنی مخلوقات کے درمیان فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اس نے حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا ہے اور اس لئے وہ فتاح ہے دوم یہ کہ فتاح وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر خیر و سعادت کے دروازے کھول دیتی ہے اور ان کی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے پھر ایسی آسانی یا تو امور دین کے متعلق ہو گی

جیسے علوم شرائع و دیانات کا عطا فرمانا یا امور دنیا میں جیسے فقیر کو غنی بنانا یا کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کو دور کرنا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ فتاح وہ ذات ہے جو قلوب اہل ایمان پر اپنی معرفت کے اور اہل معصیت پر اپنی مغفرت کے دروازے کھول دے اور بعض لکھتے ہیں کہ فتاح وہ ذات ہے جو مصائب میں اعانت کرے اور وجود احسان کو آسان بنائے بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ فتاح وہ ذات ہے جو باب توفیق کو نفوس پر کھول دے اور اسرار و معارف کی تحقیق عطا فرماوے بعض نے لکھا ہے کہ فتاح وہ ذات ہے جو بندوں کے عصیان پر عطاء نعمت کو بند نہیں کر لیتی اور ان کے نسیان پر اپنی رحمت کو موقوف نہیں کرتی بعض نے کہا ہے کہ فتاح وہ ہے جس کا حکم قطعی اور اس کی مشیت اٹل ہو۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہے کہ وہ مجاہدت کو ایسا کامل کرے کہ ابواب مکاشفات اس پر مفتوح ہو جائیں اور لوگوں کو خیر و سعادت کا اضافہ کرے۔

خاصیت

بعد نماز فجر سینہ پر ہاتھ رکھ کر ستر بار پڑھے تمام امور میں آسانی ہو اور قلب میں طہارت و نورانیت ہو اور رزق میں آسانی ہو۔

العَلِیمُ

جل جلالہ

مصدر علم سے کئی ایک صیغے ذات باری نے اپنے لئے قرآن مجید میں استعمال کئے ہیں اول وہ صیغے جن سے صفت علم کا ذات باری کے لئے اثبات ہوتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پھر فرمایا وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْئٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اور پھر فرمایا اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ دوم صیغہ عالم ہے چنانچہ فرمایا عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اور نیز فرمایا عَالِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سوم صیغہ علام چنانچہ فرمایا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ چہارم صیغہ اعلم چنانچہ فرمایا رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ اور پھر فرمایا اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ پنجم صیغہ علم باب تفعیل سے چنانچہ فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ پھر فرمایا وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمْ مگر جمیع علماء امت نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ گو باب تفعیل سے کئی ایک صیغے ذات باری کے لئے قرآن مجید میں آچکے ہیں مگر ہم اس ذات اقدس کو معلم بصیغہ اسم فاعل تعبیر نہیں کر سکتے اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسماء ذات باری شرعی ہیں نہ قیاسی شروع کتاب میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے اس مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت بعض مقامات

میں بعض الفاظ ایسے وارد ہوئے ہیں جن سے ان کے حق معصیت کا گمان پیدا ہوتا ہے اور اس لئے ہم ان پر عاصی یا مذنب کا لفظ اطلاق کر سکتے ہیں یا نہیں مثلاً عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی سو کیا ہم آدم علیہ السلام کو عاصی کہہ سکتے ہیں یا دختر شعیب علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی نسبت قرآن مجید میں وارد ہوا ہے یَآ اَبَتِ اسْتَاْجِرْہُ (اے باپ موسیٰ کو اجرت پر رکھ لو) کیا ہم موسیٰ علیہ السلام کی نسبت اجیر (مزدور) کا لفظ بول سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ جس طرح معنی کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے اسی طرح ادب کا ملحوظ رکھنا بھی لابد ہے۔

ششم صیغہ علیم ہے قال اللہ تعالیٰ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان مختلف صیغوں کا مفہوم بھی مختلف ہے اور ان کی بناء کا مختلف ہونا ان کے مختلف المفہوم ہونے پر کافی دلیل ہے چنانچہ علیم جو وزن فعیل پر ہے مبالغہ کے لئے موضوع ہے اور بمقابلہ عالم اپنے ماخذ (علم) پر قوی طور پر دلالت کرتا ہے اور اس کی مثال بعینہ سامع اور سمیع اور راحم اور رحیم کی سی ہے مع ھذا فعیل کا وزن ثبوت اور استمرار پر دلالت کرتا ہے اور آیة وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صیغہ علیم صیغہ ذی علم سے زیادہ مبالغہ پر مشتمل ہے۔

واضح ہو کہ مصدر علم سے صیغہ علامة بھی مشتق ہوتا ہے اور یہ لفظ گو مبالغہ کے لئے ہے مگر ذات باری پر اس کا اطلاق نہیں ہوا اور نہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے چنانچہ کسی بڑے عالم کی نسبت تو یہ کہہ سکتے ہیں ھو علامة مگر ذات باری کی نسبت نہیں بول سکتے اس صیغہ کے آخر میں حرف ہا مبالغہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ذات باری کی نسبت اس کے عدم استعمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ صیغہ ایسے شخص کے حق میں بولا جاتا ہے جس نے حالت نقصان سے حالت کمال تک ترقی کی ہو اور یہ امر ذات باری کی نسبت متصور نہیں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذات باری کے علم کی حقیقت انسانی علم کی سی نہیں اور ان ہر دو

میں بوجوہ چند اختلاف ہے اول یہ کہ ذات باری کا علم ایک ہی علم ہے جس سے وہ تمام جزئیات عالم کا علم رکھتا ہے مگر انسان کا علم ایسا نہیں کیونکہ اس کو ہر ایک چیز کی نسبت علیحدہ علم کی ضرورت پڑتی ہے دوم ذات باری کا علم غیر متبدل ہے اور انسانی علم متغیر ہو جاتا ہے سوم ذات باری کا علم بذریعہ حواس اکتساب نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا علم ذاتی ہے اور انسان کا علم بواسطہ حواس اکتساب کیا جاتا ہے چہارم ذات باری کا علم ممتنع الزوال ہے اور انسان کا علم ممکن الزوال پنجم ذات باری کا ایک علم اس کو کسی دوسرے علم سے روک نہیں سکتا مگر انسان کو یہ بات حاصل نہیں ششم ذات باری کا علم غیر متناہی ہے اور انسان کا علم متناہی ہے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ علیم وہ ذات ہے جس پر کوئی امر مخفی نہ ہو سکے اور کوئی قریب و بعید امر اس پر مستور نہ ہو اس لئے جو شخص اس ذات کی نسبت ایسا یقین رکھتا ہے وہ کبھی معصیت سے دل آزردہ اور شاکی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمیشہ اس کے احسان کا شکر گذار اور اپنے گناہوں کی بابت عذر خواہ رہتا ہے امام غزالی فرماتے ہیں کہ علم ذات باری کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر ایک چیز پر ظاہر ہو یا باطن صغیر ہو یا کبیر اول ہو یا آخر الغرض تمام اشیاء پر محیط ہے اور وہ مکتسب نہیں بلکہ دیگر علوم اس کے علم سے مستفاد ہیں کیونکہ انسان کا علم اشیاء خارجیہ سے اخذ کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تو تمام اشیاء کا خالق ہے اور وہ انہیں ان کے وجود سے پہلے سے جانتا ہے کیونکہ اس کا خالق الاشیاء ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قبل از وجود ان کا علم رکھتا تھا اور اس کی مثال یوں سمجھو کہ شطرنج کا واضع وضع شطرنج سے پہلے اس کا علم رکھتا تھا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ وضع نہ کر سکتا مگر ہمارا علم شطرنج کی نسبت شطرنج کے وجود سے اخذ کیا گیا ہے اس لئے ہمارا اور واضع کا علم ایک نہیں ہو سکتے۔

پھر لکھتے ہیں کہ انسان کا شرف علم ہی سے ہے اور علم اشرف وہ ہے جس کا موضوع یا معلوم اشرف ہو اور جس قدر کوئی معلوم شریف ہو گا اسی قدر اس کا علم بھی دیگر علوم کی نسبت شریف سمجھا جائے گا چونکہ ذات باری اشرف

المعلومات ہے اس لئے ذات باری کا علم حاصل کرنا جس کو معرفت الٰہی بولتے ہیں تمام علوم کی نسبت اشرف ہے اور دیگر اشیاء کے علوم بھی اس لئے شریف سمجھے جاتے ہیں کہ وہ معرفت الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ اشیاء کا وجود افعال ذات باری کا نتیجہ ہے اس لئے افعال ذات باری کی معرفت در حقیقت ذات باری کی معرفت ہے اس لئے معلوم ہوا کہ جو چیز واسطہ معرفت الٰہی ہو اس کا علم بھی شریف ہو گا اسی خیال پر علم فقہ و حدیث تمام دیگر علوم کی نسبت اشرف سمجھے جاتے ہیں۔

خاصیت

اس کی کثرت و مداومت سے حقائق و معارف منکشف ہوتے ہیں اور حافظہ قوی ہوتا ہے۔

القَابِضُ البَاسِطُ

جل جلالہ   جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ ان ہر دو اسماء کا ذکر یک جا لانا ضروری ہے کیونکہ کمال قدرت اس امر کا مقتضی ہے کہ ہر دو متضاد پہلو پر حاوی ہو مع ھذا اگر صرف القابض کا ذکر بدوں الباسط کے کریں تو اللہ تعالیٰ کو صرف صفت منع و حرمان کے ساتھ ذکر کرنا لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔

قبض وبسط کے لغوی معنی علیحدہ علیحدہ تنگ پکڑنے اور فراخ کرنے کے ہیں اور یہ معنی تمام اشیاء موجودات کو احاطہ کئے ہوئے ہیں چنانچہ موارد ذیل قابل غور ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ رزق میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے اور اس فراخی اور تنگی میں اس کی مصلحتیں ہیں جن کو وہی بہتر جانتا ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ وَلَوْبَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے روزی کو فراخ کر دیتا تو زمین میں ظلم کرنے لگ جاتے مگر وہ اپنی

حکمت کاملہ سے اسی قدر عطا فرماتا ہے جس قدر مناسب ہوتا ہے۔

(۲) بادلوں میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے چنانچہ فرمایا اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُہٗ فِی السَّمَاءِ کَیْفَ یَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہواؤں کو چھوڑتا ہے پھر وہ ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر انہیں آسمان میں (خلاء میں) جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔

(۳) سایہ و نور میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے قال اللّٰہ تعالیٰ ثُمَّ قَبَضْنٰہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا یعنی پھر ہم اس سایہ کو تھوڑا تھوڑا اپنی طرف سمیٹتے چلے آتے ہیں۔

(۴) ارواح میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے قبض تو موت کے وقت اور بسط حیات کے وقت۔

(۵) زمین میں قبض وبسط قال اللّٰہ تعالیٰ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ اور نیز فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِہَادًا ای بساطاً

(۶) قبض صدقات قال اللّٰہ تعالیٰ یَاْخُذُ الصَّدَقَاتِ والاخذ بمعنے القبض

(۷) قبض وبسط قلوب

واضح ہو کہ قلوب میں قبض وبسط کی حالت بعینہ خوف و رجا کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے کیونکہ خوف کسی امر ناگوار کے زمانہ مستقبل میں وقوع کے متعلق ہوتا ہے اور رجا کسی امر مطلوب کے حصول کے متعلق البتہ قبض وبسط میں ماضی و مستقبل نہیں ہوتا اور خوف و رجا میں زمانہ مستقبل کا تعلق ضروری ہے جس طرح خوف و رجا میں قوت وضعف کے لحاظ سے مدارج ہوتے ہیں اسی طرح قبض وبسط کے بھی مدارج مختلفہ ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ موجب قبض بعض اوقات تو معلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات نامعلوم ایسی حالت میں بجز تسلیم کچھ چارہ نہیں کیونکہ حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر سالک قبض کے دور کرنے میں کوشش کرے تو قبض اور بھی بڑھ جاتی ہے اور

جب تسلیم اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ فی الفور زائل کر دیتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ یَقۡبِضُ وَیَبۡسُطُ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں الخوف یقبضنی والرجاء یبسطنی فاذا قبضنی الخوف افنانی واذا بسطنی الرجاء احیانی یعنی خوف میرے لئے موجب قبض ہے اور رجا موجب بسط سو بحالت قبض میں مر جاتا ہوں اور بحالت بسط زندہ ہو جاتا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ اس ذات اقدس کا جلال موجب قبض اور جمال موجب بسط ہے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام کو حکم دے گا کہ اہل جہنم کو جہنم کی طرف چلاؤ آدم علیہ السلام عرض کریں گے خدایا کس قدر افراد کو جہنم کی طرف چلاؤں حکم ہو گا کہ ہزار میں سے نوے نانوے اہل جہنم ہیں حضور علیہ السلام کا یہ کلام سن کر صحابہ سخت پریشان ہوئے اور جب صبح ہوئی اور حضور انور نے انہیں مغموم پایا تو فرمایا کہ تمہاری تعداد تمام گذشتہ امتوں کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتی ہے جو سفید بیل کے جسم پر سیاہ خال کو اس کی سفیدی جسم سے ہوتی ہے اس ارشاد نبوی کے پہلے حصہ سے صحابہ کے قلوب میں قبض پیدا ہو گئی تھی اور دوسرے حصہ سے بسط کیونکہ پہلے حصہ میں جلال اور دوسرے میں جمال کی طرف اشارہ ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ قابض وہ ذات ہے کہ جو اپنے جلال کو قلب سالک پر مسلط کرے اور باسط وہ ذات ہے جو اپنے جمال کو قلب سالک پر منکشف کرے بعض لکھتے ہیں کہ قابض وہ ذات ہے جو اپنے فراق کا بندہ کو خوف دلائے اور باسط وہ ذات ہے جو اپنے عفو سے اس کو امن بخشے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں بندگان خدا میں سے قابض و باسط وہ شخص ہوتا ہے جس کے قلب پر حکمت کے عجائبات منکشف ہوں اور اسے ایسا کلام عطا کیا جاوے جو باوجود اختصار کے نہایت جامع ہو ایسے کلام کو جوامع الکلم بولتے ہیں۔ سو کبھی تو ایسا شخص عباد اللہ کو دلائل رجا سے بسط اور کبھی دلائل

خوف سے قبض کا افاضہ کرتا ہے۔

خاصیت

(القابض) چالیس روز روٹی کے لقمہ پر اس کو لکھ کر کھاوے تو بھوک سے تکلیف نہ ہو۔

(الباسط) نماز چاشت کے بعد دس بار پڑھنے سے رزق میں فراخی ہو۔

دعاء

یا من اظهر الجميل وستر القبيح ويا من لا يواخذ بالجريرة ولايهتك الستر يا عظيم العفويا حسن التجاوز يا واسع المغفرة يا باسط اليدين بالرحمة يا صاحب كل نجوى يا منتهى كل شكوى يا كريم الصفح يا عظيم المن يا مبتدى النعم قبل استحقاقها يا ربنا ويا سيدنا ويا مولانا وياغاية رغبتنا اسالك يا الله ان لاتشوى خلقى بالنار. (حصن حصين)

اَلْخَافِضُ الرَّافِعُ

جل جلالہ   جل جلالہ

خفض کے معنی لغت میں پست کرنے اور رفع کے معنی بلند کرنے کے ہیں قال اللّٰہ تعالیٰ یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ اور قیامت کی صفت میں فرمایا خافضۃ رافعۃ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ دین میں خفض و رفع سے اضلال و ارشاد مراد ہے خواہ معرفت ذات باری کے متعلق ہو یا طاعت کے متعلق اور دنیا میں رفع و خفض سے درجات بلند کرنا اور ساقط کرنا مراد ہوا کرتی ہے اور قیامت کو حافضہ رافعہ اس لئے کہا گیا ہے کہ کفار کو اسفل درکات جہنم میں اور ابرار کو اعلیٰ درجات جنت میں لے جائے گی اس لئے یہ ہر دو اسماء ذات باری کے صفات افعال میں سے شمار کئے گئے ہیں۔

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں ایک قوم کے لئے اہانت مقدر کر دی اور دوسری کے لئے اعانت اس لئے وہ ایک کے لئے خافض اور دوسری کے لئے رافع ہے انسان کامل کو ان سے یہ بہرہ ہے کہ وہ جانب روح کو جانب نفس پر بلند رکھتا ہے اور اولیاء اللہ کی نصرت اور اعداء اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رافع وہ ذات ہے جو اولیاء کو اعلیٰ درجات عطا فرما کر انہیں اپنا مقرب بنائے اور اعداء کو اپنی بارگاہ سے دور رکھے۔ یا یوں کہو کہ اولیاء کو محسوسات اور شہوات سے بالا تر لے جا کر گروہ ملائکہ میں داخل کر دے اور اعداء کو لذات حیوانیہ دنیویہ میں مبتلا رکھے۔

خاصیت

(الخافض)

پانچ سو بار پڑھنے سے حاجت پوری ہو۔

(الرافع)

ستر بار پڑھنے سے ظالموں سے امن میں ہو۔

الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ

جل جلالہ　　جل جلالہ

یہ ہر دو اسم بھی یکجا ذکر کئے جاتے ہیں ایک کا بدوں دوسرے کے ذکر کرنا ذات باری کے حق میں موجب نقص ہے قال اللہ تعالیٰ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ان ہر دو اسماء کی توجیہ کے لئے امور میں غور کرنا چاہیے کہ انسان کا کمال اس امر میں ہے کہ ذات حق کی معرفت محض ذات حق کے لئے حاصل کرے اور امر خیر کی حقیقت کو اس لئے سمجھے کہ اس پر عامل ہو سو جب بندہ صبر کو یہاں تک لازم پکڑ لے کہ انوار ربوبیت کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جائے اور ماسوی اللہ سے اس کی التفات منقطع ہو جائے تو اس کو حقیقی اعزاز کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور اگر اس کی حالت اس کے برخلاف ہو تو مقام اذلال میں انحصرتا ہے اور ان ہر دو میں بہت سے مدارج ہیں جو مشاہدہ انوار ربوبیت کی نسبت کی رو سے مختلف ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ عزت مطلق کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ تمام ماسوائے اللہ سے احتیاج کو منقطع کر لے اور چونکہ عدم احتیاج مخصوص بذات باری ہے اس لئے حقیقی عزت کا مالک بھی وہی ہے قال اللہ تعالیٰ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معزمذل سے وہ ذات اقدس مراد ہے جو اپنی مشیت ازلی کے مطابق جس کو چاہتا ہے ملک حقیقی کا مالک بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم رکھتا ہے اور ملک حقیقی سے مراد ذلت احتیاج اور غلبہ شہوت سے نجات پانا ہے ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ حضیض جہل سے نکال کر اوج معرفت پر ترقی عطا فرماتا ہے سو جس کے قلب پر سے اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دیتا ہے اور جمال حضرت باری کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور مقام قناعت میں اس کو استقامت حاصل ہو جاتی ہے اور تمام مخلوقات سے بے نیاز ہو کر خداوندی تائید سے صفات نفس پر غالب آجاتا ہے وہ درحقیقت حقیقی عزت کا مالک ہے اس عالم دنیا میں بھی اور عالم آخرت میں بھی ایسے ہی شخص کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت خطاب کیا جاتا ہے يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ یعنی اے نفس مطمئنہ (جس کی اوپر تعریف ہو چکی ہے) اپنے رب کی طرف لوٹ اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہے۔ سو آج تو میرے مقبول بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا برخلاف اس کے ذلیل وہ شخص ہے جو عاجز مخلوق کا محتاج رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیئے پر قناعت نہ کر کے حرص کا کتا بن جاتا ہے اور دربدر مارا پھرتا ہے سو ایسا شخص ہمیشہ ظلمت جہل میں گرفتار رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے سلطنت عزت کو چھین لیتا ہے اور یہی حقیقی ذلت ہے اور اس ذلت کا مارا وہی شخص ہے جس کو یوں خطاب کیا جائے گا وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ الآیۃ یعنی تم لوگ نفس امارہ کی خواہشات میں مبتلا رہے اور ناپائیدار لذتوں کے پیچھے پڑے رہے ہو۔

ہر سو دو داں زدر خویش براند
وآنرا کہ خواند بدر کس ندواند

یہاں تک تو اس عزت و ذلت کا ذکر تھا جس کو روح انسانی سے تعلق

ہے جسمانی عزت وذلت کا معیار یہ ہے کہ جس شخص کو صحت و عافیت مال و جاہ شرف نسب کثرت انصار حاصل ہو وہ عزت کا مالک ہے اور جس کو یہ باتیں نصیب نہ ہوں وہ ذلیل ہے اس توجیہ کے مطابق اعزاز واذلال صفات افعال میں داخل ہیں۔

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ معزوہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کو عزت عصمت سے امتیاز بخشے اور پھر اپنی رحمت سے انہیں مغفرت عطا فرماوے اور دار آخرت میں اپنے مشاہدہ جمال سے محظوظ و مسرور کرے اور مذل وہ ذات ہے جو اپنی معرفت سے اپنے اعداء کو محروم رکھے اور انہیں اپنی معصیت کی طرف لگا کر انہیں مستحق لعنت بناوے اور جنہم میں جھونک دے بعض حضرات لکھتے ہیں کہ معزوہ ذات ہے جو بندہ کو ذلت نفس پر آگاہ کر کے اس کو عزت بخشے اور مذل وہ ذات ہے جو بندہ کو عزت نفس کے غرور میں مبتلا کر کے اس کو ذلیل کر دے۔

خاصیت

(المعز)

شب دو شنبہ و شب جمعہ کو بعد مغرب چالیس بار پڑھنے سے اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو۔

(المذل)

۷۵ بار پڑھ کر سربسجود ہو کر دعا کرے تو حاسد کے حسد سے محفوظ رہے اور جس کا حق دوسرے کے ذمہ آتا ہو اور وہ اس میں ٹال مٹول کرتا ہو اس کو بکثرت پڑھنے سے وہ اس کا حق ادا کرے۔

اَلسَّمِیْعُ

جل جلالہ

آیۃ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر دو اسم کا مفہوم ایک نہیں کیونکہ ایک ہونے کی صورت میں تکرار بلا افادہ لازم آتا ہے سمع کی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک علمی انکشاف ہے جو کسی سامع کو بذریعہ صوت کے حاصل ہو مگر یہ حقیقت ذات باری کی نسبت صحیح نہیں کیونکہ اس کا علم باہر سے مکتسب نہیں بلکہ ذاتی ہے اور یہ امر کچھ حقیقت سمع ہی سے مخصوص نہیں بلکہ دیگر معلومات کی نسبت بھی ایسا ہی خیال کیا جا سکتا ہے مثلاً ہماری مبصرات کا علم بذریعہ قوت باصرہ باہر سے آتا ہے اور ذات باری کے لئے ایسا قیاس کرنا غلط ہے بلکہ ذات باری کے معلومات کو ہمارے معلومات سے وہی نسبت ہے جو خود ذات باری کو ہماری ذات سے نسبت ہے الغرض سمع اور بصر وغیرہ صفات صرف بطور اشتراک لفظی ہمارے اور ذات باری کی نسبت بولے جاتے ہیں ورنہ ان کی حقیقت ایک نہیں ہمارے صفات ناقص حادث معلول ہیں اور ذات باری کے صفات ان عیوب سے بری ہیں جو لوگ مادی اشیاء سے بالاتر حقائق کا ادراک نہیں کر سکتے ان کا علم صفات باری کی نسبت نہایت ضعیف ہے حالانکہ وہ ذات

مقدس اپنی مخلوق اشیاء اور ان کے صفات کی مناسب سے بالاتر ہے اور لیس کمثلہ شی اس کا وصف ذاتی ہے سماع بمعنے قبول و اجابت بھی مستعمل ہے چنانچہ ایک دعائے ماثورہ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں اللھم انی اعوذبک من قول لایسمع ای من دعاء لایستجاب اور نماز میں کہا جاتا ہے سمع اللہ لمن حمدہ ای قبل اللہ حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ سمیع ذات باری کو اس لئے بولا جاتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی عاجزی اور فروتنی پر متوجہ ہوتا ہے اس کو ایک بندہ کی پکار دوسرے بندہ کی پکار سننے سے نہیں روک سکتی بعض لکھتے ہیں کہ اس اسم کی توجیہ یوں ہے کہ ذات باری عین اضطرار کے وقت اپنے بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی مصیبت کو دور کرتا ہے اور طالب مغفرت کو مغفرت عطاء فرماتا ہے اور عذر کرنے والے کا عذر مانتا ہے امام غزالی فرماتے ہیں کہ انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کو جب سمع ذات باری کی حقیقت کا پتہ لگ جاتا ہے تو وہ اپنی زبان کی محافظت کرتا ہے اور کبھی کوئی کلمہ ناجائز یا عبث منہ سے نہیں نکالتا اور وہ اپنی سمع کو کلام الٰہی کے سننے میں مشغول کر کے ہدایت کا ذخیرہ جمع کرتا ہے۔

خاصیت

جمعرات کے روز بعد نماز چاشت پانچ سو مرتبہ پڑھ کر جو دعا کرے قبول ہو

البصیر

جل جلالہ

بصیر فعیل کا وزن ہے جس کے معنے مبصر کے ہیں جیسے الیم بمعنے مؤلم درد دینے والا ذات باری کی حقیقت بصر کو حقیقت سمع پر قیاس کرنا چاہیے یعنی جس طرح سمع ذات باری انسانی سمع سے بالاتر ہے اور محض بطور اشتراک اسمی ہر دو پر سمع کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے اسی طرح اس کی حقیقت بصر انسانی بصر سے بالکل علیحدہ ہے کیونکہ انسانی بصر تو حدقہ حلقہ چشم اور الوان و صور سے منطبع ہونے کی محتاج ہے مگر ذات باری ان اشیاء کی محتاج نہیں اس لئے بصر ذات باری کی حقیقت ایک ایسی صفت ہے جس سے ذات باری کے سامنے ایک ایک ذرہ کائنات کا بلکہ اس سے بھی زیادہ دقیق اشیاء از خود منکشف ہیں اور یہ انکشاف اس درجہ کمال پر ہے اس سے زیادہ ناممکن اور غیر متصور ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جو شخص ذات باری کی حقیقت بصر سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنے باطن کو مراقبہ اور ظاہر کو محاسبہ سے آراستہ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی معصیت کرنا چاہو تو ایسی جگہ کرو کہ جہاں وہ تمہیں نہ دیکھتا ہو اور بعض یوں لکھتے ہیں کہ سمیع وہ ذات ہے جو باطن کے راز اور

مخفی منصوبوں سے مطلع ہو اور بصر وہ ذات ہے جو تحت الثریٰ سے عرش بریں تک کے اشیاء کو دیکھتا ہو انسان کامل کو اس سے دو قسم کا بہرہ ہوتا ہے اول حس ظاہری کے لحاظ سے جس میں وہ دیگر حیوانات کے ساتھ شریک ہے اور یہ بہرہ بہت کم درجہ کا ہے کیونکہ محسوسات کے ادراک سے زیادہ کچھ مفید نہیں دوم نور بصیرت جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس بات کا یقین کر لے کہ بصارت عجائبات کائنات میں جو زمین و آسمان میں موجود ہیں غور کر کے عبرت حاصل کرنے کے لئے دی گئی ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ مخلوقات میں کوئی آپ کا مثل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی نظر عبرت اور کلام ذکر الٰہی ہو وہ میرا مثل ہے اسم بصیر کا ایک حظ یہ بھی ہے کہ عبد کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے اس لئے اس سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوتی اور جو شخص لوگوں سے معصیت کو چھپاتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے وہ در حقیقت سخت گستاخ اور زیاں کار ہے اور اگر اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں دیکھتا تو وہ کافر ہے مراقبہ جو ثمرہ ایمان ہے اسم بصیر ہی کی حقیقت پر مطلع ہونے کا نتیجہ ہے اور احسان بھی اسی اسم کی حقیقت کا نتیجہ ہے جس کی نسبت حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح پر عبادت کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

خاصیت

بعد نماز جمعہ کے سو مرتبہ پڑھنے سے بصیرت میں صفائی اور نیک اعمال کی توفیق ہو۔

اَلْحَکَمُ

جل جلالہ

زجاج نحوی کہتے ہیں کہ حاکم اور حکم کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے واسط اور وسط اور حکم لغت میں منع یعنی کسی کو کسی امر سے روکنے کے لئے مستعمل ہے چنانچہ حکمہ لگام کو بولتے ہیں کیونکہ گھوڑے کو روکتی ہے اور حکمت بمعنی دانش ہے کیونکہ آدمی کو سفاہت سے روکتی ہے اور یہی معنی حکم میں ملحوظ ہیں کیونکہ مدعی اور مدعا علیہ کو تعدی سے روکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے وصف حکم کو ثابت کیا ہے چنانچہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ اور اَلَا لَہُ الْحُکْمُ اور لَہُ الْحُکْمُ وغیرہ الفاظ قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اس لئے حاکم اور حکم کے معنی ایسی ذات کے ہیں جس کا فیصلہ قطعی ہو اور اس کو کوئی رد نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کے حکم کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے کہ کس طرح اس نے سعادت و شقاوت کے اسباب کا سلسلہ دنیا میں قائم کر دیا ہے قضا و قدر در حقیقت حکم ذات باری پر مترتب ہیں اور انہیں پر یہ تمام سلسلہ کائنات کا چل رہا ہے جس نے حکم ازلی سے اسباب کلیہ کو وضع کر کے ان کے مسببات کو ان کے متعلق کر دیا ہے اور مسببات کو اسباب کے متعلق کرنے سے یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی مشیت ازلی کے

مطابق محدودہ مقدرہ محسوبہ متناسبہ تحریکات حوادث کے متعلق آناً فاناً پیدا کرتا رہتا ہے اس لئے سعادت و شقاوت کے متعلق بھی ایک ایک آن میں مناسب اسباب ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں مطلقاً بالحاظ کمیت و کیفیت کے کمی بیشی کو دخل نہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی امر احاطہ قضا و قدر سے خارج نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی کے حق میں سعادت کا حکم نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس کے، اسباب مناسبہ کو متوجہ کر دیتا ہے علیٰ ہذا شقاوت کے اسباب مناسبہ کو بھی اسی طرح ظہور میں لاتا ہے اسباب سعادت قلب بسط و انشراح اور اسباب شقاوت قبض و انغلاق کا موجب ہو کر حکم ازلی کو پورا کر دیتے ہیں نظر دقیق اس امر کا فیصلہ کرتی ہے کہ تمام امور عالم کا انتظام سلسلہ اسباب و مسببات سے وابستہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کا ایک اندازہ مقرر فرما رکھا ہے اور تمام عالم بمنزلہ ایک کل کے ہے جس کے پرزے اپنی اپنی جگہ حرکت کر رہے ہیں اور نتیجہ معینہ ظہور پذیر رہتا ہے زمین و آسمان چاند اور سورج عناصر اربعہ کی کل کے لئے بمنزلہ پرزوں کے ہیں مثلاً غور کرو کہ آفتاب جب اپنی حرکت میں افق مشرق پر نمودار تو دنیا میں روشنی پھیل جاتی ہے اور لوگ اس کی روشنی میں اپنے کاروبار کو سرانجام دیتے ہیں اور اس کی حرارت سے نباتات و جمادات تربیت پاتے ہیں اور جب مغرب میں چلا جاتا ہے تو لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر آرام لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جب وسط آسمان یعنی خط استواء سے قریب آجاتا ہے تو موسم گرما میں ضروری پیداواریں تیار ہوتی ہیں اور جب خط استوا سے دور چلا جاتا ہے تو موسم زمستان میں سردی پڑنے لگتی ہے اور اس موسم کے متعلقہ نباتات نشوونما پاتی ہیں اور جب خط استواء اور قطب شمالی یا قطب جنوبی کے درمیان ہوتا ہے. تو اعتدال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر دو موسم بہار یعنی ربیع و خریف کا دورہ ہوتا ہے فصول اربعہ کے یہ تغیرات گو ایسے واضح امور ہیں جن سے ہر ایک شخص واقف ہے مگر ان کے ذیل میں ہزاروں عجائبات کا مخفی خزانہ ودیعت رکھا گیا ہے جن سے ذات باری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نظام کائنات کا ثبوت ملتا ہے اور یہ سب کچھ

مشیت ازلی پر مبنی ہے قال اللہ تعالیٰ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ یعنی شمس و قمر کے حرکات ایک اندازہ معین پر رکھے گئے ہیں جس کے مطابق عالم کائنات میں لاکھوں حوادث ضروریہ کا وقوع ہوتا رہتا ہے اور اس حسبان میں اشارہ ہے اسی مشیت ازلی کی طرف جس پر قضاء و قدر کے احکام مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی کو تدبیر اول بولتے ہیں مذکورہ بالا تقریر سے مسئلہ جبر و اختیار کی صورت بھی واضح ہو سکتی ہے وہ لوگ جو حقیقت تقدیر کا انکار کیا کرتے ہیں اور انسان کو مختار مطلق مانتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ کے مطابق کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں کوئی کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کرتا اور قرآن مجید میں یوں وارد ہوا ہے مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ یعنی جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو شخص چاہے انکار کر دے اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود مختار ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی جبر نہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم مان لیں کہ کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا انسان کو اختیار ہے اور وہ آزاد محض ہے تو اس ارادہ کی علت کیا ہے جس پر اس کا کرنا یا نہ کرنا مبنی ہے کیا اس ارادہ کا پیدا کرنا بھی انسان کا فعل مانا جاوے تو اس ارادہ کے لئے بھی ارادہ کی ضرورت ہو گی علیٰ ہذا القیاس تسلسل لازم آئے گا جس کے مان لینے پر لازم آئے گا کہ انسان سے کبھی کوئی فعل ہی وقوع میں نہ آسکے لہذا ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ انسان اپنے افعال میں مختار مطلق نہیں بلکہ تابع مشیت الٰہی ہے رہا مذکورہ بالا آیت سے استدلال سو وہ نہایت استحکام کے ساتھ مشیت الٰہی کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ اس میں گو بظاہر مشیت انسان کو مطلق ثابت کیا ہے مگر دوسری آیات سے اس کا مقید ہونا خود ثابت ہو رہا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ اس لئے مذہب صحیح بھی ہے کہ انسان اضطرار و اختیار کے مابین رکھا گیا ہے یعنی ہم فاعل ہیں مگر ہمارا فعل مشیت ذات باری پر موقوف رکھا گیا ہے کیونکہ ہماری مشیت معلول ہے مشیت باری کا اور بس ایک حدیث سے اس کی تائید یوں ہوتی ہے۔ قلب المومن بين

اصبعین من اصابع الرحمن یعنی مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان رکھا ہے جس طرح چاہتا ہے اسے پھرا دیتا ہے گو یہ حدیث منجملہ متشابہات کے ہے مگر محققین متاخرین نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ دو انگلیوں سے خیر و شر کے وہ دو سبب مراد ہیں جو ارتکاب فعل یا ترک فعل کا موجب ہوتے ہیں اور قلب ان ہر دو سبب کے درمیان رکھا گیا ہے اگر سبب فعل مشیت باری سے حاصل ہو جائے تو ارتکاب فعل ہو جاتا ہے اور اگر سبب ترک موجود ہو تو فعل ظہور میں نہیں آسکتا یہی وجہ ہے کہ ایک دعائے نبوی میں یہ الفاظ مروی ہیں۔ یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك اور اگر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ قلب (دل) قلب کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسباب مختلفہ کے پیش آنے پر ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منقلب ہوتا رہتا ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ چشم بصیرت سے دیکھ لیتا ہے کہ تمام امور مقدرہ حسب مشیت ازلی جاری ہیں جن میں کمیت و کیفیت کے رو سے کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا سو جب اس کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ مقدر ازلی اٹل ہے تو اس کو مستقبل سے کچھ سروکار نہیں ہوتا بلکہ جو حالت اس پر گذرتی ہے اس کو سابقہ ازلی کا نتیجہ سمجھ کر مطمئن رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے من عرف سر اللہ فی القدر ھانت علیہ المصائب جو شخص اللہ تعالیٰ کے راز قضا و قدر کو جان لیتا ہے اس پر مصائب آسان ہو جاتے ہیں اور پھر فرمایا المقدور کائن والھم فضل یعنی امر مقدر کا وقوع ضروری ہے اور کوشش و محنت امر زائد ہے اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ کوشش و محنت مقدر سے کوئی خارج امر ہے نہیں بلکہ یہ بھی مقدر ہی ہے مگر اس کو کسی امر کے دفع کرنے میں کچھ دخل نہیں کیونکہ اگر اس کو دفع میں کچھ دخل ہوتا تو لازم آتا کہ فرع (کوشش و محنت) اپنے اصل (مشیت ازلی) کو باطل کر دے اور یہ محال ہے۔

بعض محققین اہل باطن کا قول ہے کہ ہر ایک شخص اپنے خاتمہ سے ڈرا

کرتا ہے میں سابقہ ازلی سے ڈرتا رہتا ہوں کیونکہ خاتمہ کا اچھا یا برا ہونا سابقہ ازلی پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مقدرات ناممکن ہے کہ عاجز بندوں کے حیلہ سے ٹل جائیں ہم کسی باغ یا زراعت کو ہرا بھرا دیکھتے ہیں کہ ناگہاں کسی آفت کے نازل ہونے پر بے نام و نشان ہو جاتے ہیں قال اللّٰہ تعالیٰ اَتَاهَا اَمْرُنَا لَيْلاً اَوْنَهَاراً فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْداً كَاَن لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ اسی طرح عبد کا حال ہے کہ وہ عمر بھر عبادات میں مجاہدات و ریاضت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اس کو قعر جہنم میں لے جاتی ہے فاعاذنا اللّٰہ تعالی

ایک وہ لوگ جنہیں اپنے خاتمہ کی فکر ہے اور ایک وہ جنہیں سابقہ ازلی پر نظر ہے اور ایک وہ حضرات ہیں جنہیں غایت استغراق کی وجہ سے حال کی طرف بھی توجہ نہیں یہی لوگ ہیں جو سب سے بڑھ کر مقرب بارگاہ ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں وَقَلِيْلٌ مَّاهُمْ

خاصیت

نصف شب کے وقت باوضو حضور قلب سے ذرا دیر تک پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو مجلی اسرار فرمائیں۔

العَدلُ

جل جلالہ

عدل مصدر ہے اور بطور مبالغہ فی الوصف اس سے عادل مراد لیا کرتے ہیں جیسے رب سے راب برسے بار مراد ہے یعنی مصدر بمعنے صیغہ صفت (اسم فاعل) کے اکثر مستعمل ہے یقال عدلت الشی اعدله اذا قومته یعنی عدل کے معنی راست کرنے کے ہیں جو کج کرنے کی ضد ہے اعتدال فی الامور اسی سے مشتق ہے جس کے معنی استقامت کے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے عدل ہونے سے یہ مراد ہے کہ ذات باری تمام نقائص سے جو افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں بالکلیت پاک ہے مثلاً وہ تنزیہ اور تشبیہ ہر دو سے بالاتر ہے یعنی نہ صرف تنزیہ جس سے صفات کی نفی لازم آئے اور نہ صرف تشبیہ جس سے اس کا جسم ہونا لازم آئے بلکہ وہ ذات مقدس تنزیہ اور تشبیہ ہر دو کے درمیان ہے اور یہی مسلک جمہور حضرات ائمہ اہل السنّت والجماعۃ کا ہے چونکہ ذات باری ہر ایک قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس لئے وہ جور و ظلم سے منزہ ہے معتزلہ اور بعض دیگر اہل کفر وبدعت نے اس اسم پر اپنے ایک اعتراض کی بناء قائم کی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ جب خالق کفر ذات باری ہے اور کفر پر عذاب بھی وہی ذات

کرے گی اور یہ عذاب بھی ابدی ہوگا تو یہ کہاں کا عدل ہے اس لئے ضروری ہوا کہ خالق کفر ذات باری کا وصف خلق اس کے علم اور ارادہ پر مبنی ہے اور وہ کبھی مخالف نہیں ہو سکتے لہذا وہی ذات خالق اشیاء ہے اس معارضہ کا جواب یقیناً معترضین کے پاس کچھ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وصف عدل کا ادراک ظلم وجور کی حقیقت کے ادراک پر مبنی ہے اور ظلم کے معنی ہیں وضع الشی فی غیر موضعه یعنی کسی چیز کو ایسے محل پر رکھنا جو در حقیقت اس کا محل نہیں اور اس امر کی حقیقت کا پتہ ذات باری کے افعال میں غور کرنے سے لگتا ہے اس لئے حقیقت عدل کا ادراک افعال ذات باری میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور افعال ذات باری کی حقیقت کا پتہ اس شخص کو لگ سکتا ہے جو ملکوت السموات والارض کی موجودات اور ان کے روابط کی حقیقت سے آگاہ ہو اور سلسلہ نظام کائنات کو اسباب و مسببات کی صورت میں مشاہدہ کر سکتا ہو۔

بعض اوقات عام لوگ یہ سمجھا کرتے ہیں کہ ایذاء ظلم ہے اور کسی کو نفع پہنچانا عدل مگر در حقیقت یہ صحیح نہیں کیونکہ ایک واعظ کو شمشیر اور ایک سپاہی کو علم حدیث کی کوئی کتاب بطور انعام دینا ایصال نفع تو ہے مگر اس کو عدل نہیں کہیں گے کیونکہ عدل وہی ہے جس کی تفسیر وضع الشئی فی موضعه ہے۔ کیا کرتے ہیں اس خیال کی رو سے کسی کو عقوبت کرنا یا کسی مریض کو کڑوی دوائی پلانا یا اس کے زخم کا چیر پھاڑ کرنا عین عدل ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کو عین عدل سمجھتا ہے اور خواہ وہ اس کے مخالف ہوں یا موافق ان پر اعتراض نہ کرے اور اسی حظ کا نتیجہ ہے کہ وہ زمانہ یا فلک کو بھی برا بھلا نہیں کہتا جب کہ عام شعراء کا قاعدہ ہے کیونکہ اس سے حوادث کو غیر اللہ کی طرف نسبت کرنا پایا جاتا ہے بلکہ اسے یقین کلی ہوتا ہے کہ تمام حوادث ارادہ ذات باری پر مبنی ہیں اور تمام اسباب زمانہ نجوم وغیرہ اس کے ارادہ ازلی کے تابع ہیں

الغرض انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر غضب و شہوت کو قوت عاقلہ کے تابع رکھتا ہے اور جب وہ اپنی ذات میں وصف عدل سے موصوف ہو جاتا ہے تو اصلاح نفس کے بعد دیگر بنی نوع کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہوا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ یعنی ہر ایک شخص اپنی اپنی رعایا کی بابت قیامت کو پوچھا جائے گا انسان کے اعضاء اور قوی بھی اس کی رعایا ہیں۔

خاصیت

شب جمعہ میں روٹی کے بیس ٹکڑوں پر اس کو لکھ کر کھانے سے قلوب مخلوق کے مسخر ہو جاویں۔

اَللَّطِيفُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ اور پھر فرمایا اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اس اسم کی حقیقت کا ادراک بھی ذات باری کے افعال کی حقیقت پر مطلع ہونے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی تفسیر میں چار قول مذکور ہیں۔

(ا) اس چھوٹی سی چیز کو بھی لطیف کہہ دیا کرتے ہیں جو بدرجہ غایت صغیر ہونے کی وجہ سے محسوس نہ ہو سکتی ہو چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات جسم اور جہت سے بالاتر ہے اور اس کا احساس ناممکن ہے اس لئے یہاں لفظ ملزوم سے اس کا لازم معنی یعنی ذات غیر محسوس مراد ہے۔

(ب) لطیف اس شخص کو بولتے ہیں جو باریک سے باریک امور کا علم رکھتا ہو چنانچہ لطیف الید ایسے شخص کو بولتے ہیں جو اپنی صنعت میں اعلیٰ مہارت اور نزاکت کا استعمال کر جانتا ہو جس کو کوئی دوسرا نہ جا لا سکے اس تفسیر کی رو سے لطیف سے وصف علم کا اشارہ مفہوم ہوتا ہے چونکہ ذات باری کے افعال میں اعلیٰ سے اعلیٰ لطافت پائی جاتی ہے اس لئے وہ لطیف ہے۔

(ج) لطیف وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر اس طرح مہربان ہو کہ ان کو اس کے طریق لطف کا نہ تو علم ہو اور نہ ان وجوہ صالح سے جو ان کی بہبودی کے لئے تیار کرتا ہے کوئی آگاہ ہو قال اللّٰہ تعالیٰ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ

(د) امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم لطیف کا استحقاق اس ذات کو حاصل ہے جو دقیق سے دقیق مصالح کا علم رکھنے کے ساتھ ان مصالح کو ان کے مناسب مواضع تک نہایت نرمی کے ساتھ پہنچادے اور جب یہ علم اور عمل ہر دو کسی ذات کو حاصل ہوں تو وہ بدرجہ کمال لطیف ہے سو یہ کمال بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں کمال علم تو ظاہر ہے کیونکہ کوئی امر ظاہر ہو یا باطن ذات باری پر مخفی نہیں بلکہ ہر دو اس کے نزدیک یکساں ہیں اور افعال میں اس کے رفق یعنی نرمی کا یہ حال ہے کہ عقل انسانی اس کے حصر سے عاجز ہے دیکھو انسان کے ہیکل عنصری میں کس قدر قوتیں عمل کر رہی ہیں مگر انسان کو ان کے عمل کا کچھ علم نہیں ہوتا عالم کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر ہم اس میں سے صرف ایک لقمہ کی تشریح کرنے لگیں جس کو انسان اپنے منہ میں رکھتا ہے تو اس کی ابتداء سے انتہا تک کے اسباب کو بیان کرنے کے لئے تمام کائنات کے آسمانی اور زمینی ورق الٹنے پڑیں گے اور پھر بھی ہم ہزاروں اور لاکھوں مخفی اسباب سے بے خبر رہیں گے اور ان اسباب ضروریہ کے عمل کی رو سے ذات باری کو مختلف اسماء سے تعبیر کریں گے چنانچہ وہ حکیم ہے جواد ہے مصور ہے عدل ہے لطیف ہے اور اس تشریح کی حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو افعال ذات باری کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔

واضح ہو کہ ذات باری کے لطف کا نتیجہ ہے کہ اس نے ہمیں حصول سعادت کے اسباب پر آگاہ کر کے ان کے استعمال کی توفیق دی جبکہ ایک مختصر مدت العمر میں اس نے اپنے دنیوی یا اخروی انعامات سے بہرہ یاب ہونے کا موقع دے رکھا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ لطیف وہ ذات ہے جو ہر ایک مشکل کو

آسان بنادے اور ہر ایک شکستہ کا جبر کرے اور بعض فرماتے ہیں کہ لطیف وہ ذات ہے جو ابتداء میں توفیق عمل صالح عطا فرماوے اور انتہاء میں اس کو پایہ قبول بخشے اور بعض نے یوں تفسیر کی ہے کہ لطیف وہ ذات ہے کہ باوجود والی ہونے کے ستر عیوب کرے اور اپنی عطاء سے غنی بناوے۔

انسان کامل کو اس سے یہ بہرہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر شفقت ورافت کا اظہار فرمادے جس کی اعلیٰ صورت یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو دعوت الی الحق کرے بعض محققین نے لکھا ہے کہ عارف کا نشان یہ ہے کہ وہ جب کسی شخص کو امر بالمعروف کرتا ہے تو طریق انبیاء علیہم السلام کے مطابق نرمی کا استعمال کرتا ہے اور درشتی سے ہرگز کام نہیں لیتا وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ سر قضاوقدر کو چشم بصیرت سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

خاصیت

۱۳۳ بار پڑھنے سے رزق میں وسعت ہو تمام کام لطف سے پورے ہوں۔

الْخَبِيْرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ اور پھر فرمایا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یہ اسم مصدر خبرت سے مشتق ہے جس کے معنی آگہی کے ہیں اور علماء نے اس کی تفسیر دو طرح پر کی ہے اول یہ کہ خبیر وہ ذات ہے جو اشیاء کی کنہ اور حقیقت پر مطلع ہو یقال فلان خبیر بھذا الامر ولہ بہ خبرۃ وھو اخبربہ من فلان ای اعلم مگر جب انسان کے لئے اس اسم کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ایسے علم سے ہوا کرتی ہے جو بذریعہ امتحان حاصل ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا علم امتحان یا یوں کہو کہ تجربہ و مشاہدہ پر مبنی نہیں بلکہ اس کا علم ذاتی ہے دوم عبدالملک طبری لکھتے ہیں کہ فعیل بمعنی مفعل مستعمل ہے چنانچہ یہاں بھی خبیر بمعنی مخبر یعنی خبر دہندہ ہے جیسے بدیع بمعنی مبدع اس صورت میں خبیر سے کلام ذات باری مراد ہو گا۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خبیر وہ ذات ہے جو تمام اخبار باطنہ سے آگاہ ہو اور مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں کوئی ایک ذرہ بدوں اس کے علم کے سکون و حرکت نہ کر سکے اس لئے اسم علیم کا مترادف ہے فرق

صرف یہ ہے کہ علم ذات باری کو جب خفایائے باطنہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے تو اس کو خبرۃ بولتے ہیں گویا اسم خبیر خاص ہے اور اسم علیم عام۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عالم صغیر یعنی قلب کے تمام اندرونی حالات سے بروجہ کمال آگاہ ہوتا ہے اور محاسن اخلاق اور مقابح صفات سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور اس بارے میں شیطان اور نفس کے نہایت باریک تسویلات باطلہ پر مطلع ہو کر ان سے محترز رہتا ہے۔

حضرات مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس اسم کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے وہ تقویٰ کی صراط مستقیم سے کبھی منحرف نہیں ہوتا اور خواہشات نفس سے برطرف رہتا ہے چنانچہ امام علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ جو شخص نصرت عشیرہ (قبیلہ) عزت اور بلا سلطنت ہیبت اور بلا نفقر تونگری کی خواہش رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ذلت معصیت سے نجات پا کر عزت طاعت کی بلندی پر ترقی کرے۔

خاصیت

سات روز تک بکثرت پڑھنے سے اخبار خفیہ معلوم ہونے لگیں اور جو کسی موذی کے پنجہ میں گرفتار ہو اس کو بکثرت پڑھنے سے حالت درست ہو جاوے۔

الحلیم

جل جلالہ

یہ اسم مصدر حلم سے مشتق ہے جس کے معنی سکون نفس کے ہیں علماء لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو باوجود گناہ اور جرم کے دیکھنے اور قدرت انتقام رکھنے کے مواخذہ کرنے میں جلدی نہ کرے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص انتقام میں جلدی نہ کرے مگر اس کی نیت انتقام کی ہو تو وہ حلیم نہیں کہلا سکتا بلکہ اسے حقود یعنی کینہ توز کہتے ہیں اور اگر وہ یہ عزم رکھتا ہو کہ کبھی انتقام نہیں لے گا تو اس امر کو عفوو مغفرت بولتے ہیں اور یہ حلم نہیں اس لئے سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ آیا حلم میں انتقام کا خیال بھی مضمر ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ اگر حلیم منتقم بھی ہوتا تو ذات باری کے ذوالانتقام ہونے کے کوئی معنی نہ تھے وجہ اس کی یہ ہے کہ ذوالانتقام میں جلدی یا دیر سے انتقام کا مفہوم شامل نہیں اس لئے صحیح یہ ہے کہ حلیم ذوالانتقام کا ضد ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذات باری کا علم انسانی دائرہ قیاس سے بالاتر ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب مجید میں ارشاد فرمایا۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ یعنی اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو

ان کی بد اعمالیوں پر پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس زندہ نہ چھوڑتا۔

روایت حضرات ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو فسق و فجور میں مستغرق دیکھ کر اس کی ہلاکت کی دعاء کی وہ شخص ہلاک ہو گیا پھر ایک دوسرے شخص کو اسی حالت میں دیکھا اور دعاء کی چنانچہ وہ بھی ہلاک ہوا علی ہذا ایک تیسرے کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی جب چوتھی دفعہ آپ ایک فاسق کی نسبت دعائے ہلاکت کرنے لگے تو بذریعہ وحی آپ کو بارگاہ رب العزت سے یوں ممانعت ہوئی کہ اے ابراہیم بس ٹھہر جاؤ اگر ہم ہر ایک شخص کو اسی طرح گناہوں پر مواخذہ کرنے لگیں تو روئے زمین پر سوائے گنتی کے چند آدمیوں کے کوئی زندہ نہیں رہے گا مگر ہمارا قانون ہے کہ جب کوئی معصیت کرتا ہے تو ہم اسے مہلت دیتے ہیں اگر وہ توبہ کر لے تو ہم اسی کی توبہ کو قبول فرما لیتے اور اگر معصیت پر اصرار کرتا چلا جائے تو عذاب میں تاخیر کر دیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بیچارہ ہمارے قبضہ قدرت سے کبھی باہر نہیں جا سکتا۔

روایت۔ ایک نوجوان سخت فاسق و فاجر تھا مگر اس میں خوبی یہ تھی کہ وہ جونہی گناہ کرتا فی الفور توبہ کر لیا کرتا یعنی گناہ پر اصرار نہ کیا کرتا تھا ایک دفعہ ابلیس نے اس کو ایک خاص حالت میں مخاطب کر کے کہا کہ تم کب تک ایسا کرتے رہو گے۔ ابلیس کی اس سے یہ غرض تھی کہ اس کو رحمت خداوندی ہی سے ناامید کر دے جب رات ہوئی تو وہ نوجوان اٹھا اور وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کر کے ہر دو ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور یوں مناجات کرنے لگا۔

اے میرے پاک اور سچے خدا جو معصوموں کو عصمت عطا کرتا ہے اور صالحین کی اصلاح فرماتا ہے اگر تو مجھے بچائے گا تو میں بچ جاؤں گا اور اگر تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں ذلیل ہو جاؤں گا میں تیری مشیت ازلی کے آگے مقہور ہوں میرا خیر و شر سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اے دلوں کے پھیر دینے والے خدا! میرے قلب کو اپنے پاک دین کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ جب وہ شخص

مناجات کر چکا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے گروہ ملائکہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میرے ملائکہ! کیا تم نے میرے بندے کے کلام کو سنا ہے؟ تم شاہد رہو کہ ہم نے اس کے گذشتہ نامہ اعمال کو جو کثرت گناہ سے سیاہ ہو گیا تھا آب رحمت سے دھو ڈالا ہے اور آئندہ کے لئے اس کو توفیق عصمت عطا فرمادی ہے۔

روایت۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے پڑوس میں ایک شخص نہایت فاسق و فاجر رہا کرتا تھا لوگ اس کی بے اعتدالیوں سے سخت تنگ آگئے تھے انہوں نے مجبور ہو کر ایک دن میرے پاس شکایت کی میں نے اسے بلا بھیجا اور کہا کہ یا تو تم اپنی بدکرداریوں سے باز آجاؤ یا اس محلہ کو چھوڑ دو اس نے جواب دیا کہ میں نہ تو اپنی عادت سے باز آؤں گا اور نہ ہی محلہ کو چھوڑونگا ہم نے کہا کہ ہم بادشاہ کے پاس تمہاری شکایت کریں گے اس نے کہا کہ بادشاہ مجھے خوبی جانتا ہے ہم نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لئے دعائے بد کریں گے اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی نسبت مجھ پر زیادہ مہربان ہے مجھے اس شخص کا یہ کلام سن کر سخت غصہ آیا جب رات ہوئی تو میں اٹھا اور وضو کیا اور اس کے حق میں دعائے بد کی اتنے میں ایک ہاتف غیب نے آواز دی کہ دعائے بد مت کرو کیونکہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی جماعت اولیاء میں داخل ہے مالک رحمتہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے کئے پر سخت پچھتایا اور گھر سے نکل کر اس شخص کے گھر پہنچا اس نے مجھے دیکھ کر یہ سمجھا کہ میں اسے محلہ سے نکالنے کے لئے آیا ہوں وہ مجھ سے عذر خواہی کرنے لگا میں نے کہا کہ میں اس لئے تمہارے پاس نہیں آیا بلکہ رات کو تمہاری نسبت مجھے ایک واقعہ پیش آیا ہے چنانچہ میں نے وہ واقعہ کہہ سنایا اور سنتے ہی زار و زار رونے لگا اور توبہ کی اور گھر سے نکل پڑا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی پھر اس کے بعد ایک دفعہ جب مجھے حج جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ایک مجلس میں اس شخص کو بیمار پڑا پایا اور میرے پہنچنے پر چند سانس لئے اور ملک عدم کو سدھارا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واضح ہو کہ حلم منجملہ محاسن اخلاق کے ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس فرزند ارجمند کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی ہے اس کو وصف حلیم سے موصوف ظاہر فرمایا ہے حیث قال فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو بندوں سے درگذر کر جائے اور عیوب پر پردہ پوشی کرے بعض لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے کہ پردہ پوشی کرنے کے بعد مغفرت عطا فرمادے اور بعض نے یوں تفسیر کی ہے کہ حلیم وہ ذات ہے جو حفظ مودت اور حسن عہد اور ایفائے وعدہ سے متصف ہو بعض لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو مستغرقین فی الذنوب کو معاف کر دے اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ حلیم وہ ذات ہے جس کو کسی عاصی کی معصیت غضب میں نہ لائے۔

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے وہ سب پر ظاہر ہے اور حق یہ ہے کہ حلم انسان کے لئے زینت باطنی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ حلیم اپنے حلم سے درجہ نبوت کے قریب پہنچ جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ غضب کو روکنا ایک بھاری جہاد نفس ہے جس کے ضمن میں کئی ایک اخلاقی خوبیاں مندرج ہیں۔

خاصیت

اگر رئیس آدمی اس کو بکثرت پڑھے اس کی سرداری خوب جمے اور راحت سے رہے اور اگر کاغذ پر لکھ کر پانی سے دھو کر اپنے پیشہ کے آلات و اوزار پر ملے تو اس پیشہ میں برکت ہو اگر کشتی ہو غرق سے محفوظ رہے اگر جانور ہو ہر آفت سے مامون رہے۔

دعاء

لا اله الا الله الحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم والحمد لله رب العلمين. (ترمذی)

العَظِیمُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَھُوَالْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ مصدر عظمت سے مشتق ہے

واضح ہو کہ وصف عظیم ازروئے لغت ایسے جسم پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کسی دوسرے جسم کی نسبت مساحت میں زیادہ ہو اس لئے جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ایک دوسری کی نسبت طول و عرض و عمق میں بڑی ہو تو اس کو عظیم بولیں گے اور جب کئی چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں ایک دوسری کی نسبت اور دوسری تیسری کی نسبت اور تیسری چوتھی کی نسبت علی ہذاالقیاس بڑی ہو تو جو چیز سب سے بڑی ہو گی وہ اعظم کہلائے گی اس لئے ہر ایک چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت عظیم ہوتی ہے اور ایسی چیز کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ دیکھ کر آنکھیں اس کی ہیبت سے پر ہو جائیں دوم جس کے اطراف کو آنکھ احاطہ نہیں کر سکتی جیسے زمین و آسمان کیونکہ ہاتھی اور پہاڑ بھی عظیم الجثہ ہیں۔ مگر ان کے اطراف کو آنکھ احاطہ کر سکتی ہے اس لئے زمین و آسمان بہ نسبت دیگر اشیاء کائنات کی عظیم ہیں یہی وجہ ہے کہ جسمانیات میں انہیں عظیم مطلق کہا جاتا ہے۔

جس طرح جسمانی چیزوں میں ایک چیز دوسری چیز کی نسبت عظیم ہوتی

ہے اسی طرح عقلی چیزوں میں بھی حقائق متفاوت ہیں جن میں سے بعض کا تو عقل انسانی احاطہ کر سکتی ہے اور بعض دائرہ عقل سے خارج ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حقائق عقلیہ مثلاً علم قدرت سلطنت وغیرہ کے رو سے بعض چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں جو بہ نسبت دوسری چیزوں کی بدرجہ غایت عظیم ہو سکتی ہیں چنانچہ قرآن مجید کو عظیم کہا گیا ہے اور حدیث میں ہر قل قیصر روم کو عظیم الروم کے خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے چونکہ ذات باری اپنی صفات علم قدرت عزت و سلطان وغیرہا میں تمام موجودات سے بدرجہ لاانتہائی برتر ہے اس لئے وہی حقیقی طور پر عظیم کہلانے کی مستحق ہے اس لئے وہ ہر ایک عظیم سے اعظم ہے کیونکہ اس کی کنہ صمدیت کو عقول بشری ہرگز احاطہ نہیں کر سکتیں بلکہ تمام موجودات اس کی عظمت و جبروت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ ماسوی اللہ جو کچھ وجود پذیر ہو چکا ہے اور آئندہ ہو گا متناہی ہے اور وہ ذات باکمال لاانتہائی اور متناہی کو لاانتہائی سے کچھ نسبت نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ماسوائے اللہ ذات باری کے مقابلہ میں ہیچ محض ہے قال اللہ تعالیٰ کل شئی ھالک الاوجھہ بلکہ اگر عرش بریں سے فرش زمین تک تمام افراد موجودات کا ہزار گنا موجودات وجود پذیر ہو جاوے تو پھر بھی اس کو بمقابلہ ذات باری عزاسمہ کوئی نسبت نہیں ہو سکتی کیونکہ بہر صورت وہ موجودات متناہی ہی ہو گی یہی وجہ ہے کہ کتاب مجید میں ارشاد فرمایا انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون اس کی لاانتہائی قدرت کے سامنے تمام سلسلہ کائنات کا درہم برہم کر دینا اور ایک ناتواں چیونٹی کے مسکن کا تباہ کرنا ایک ہی بات ہے فسبحانہ من ملک تحیرت العقول فی انوار صمدیتہ وبطلت الافہام فی اشراق عزتہ

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کے موازنہ کرنے کے لئے اس اصل میں غور کرنا چاہیے کہ جب دو چیزوں میں سے ایک بدرجہ غایت کامل ہوتی ہے اور دوسری بہت ناقص تو ہر دو کے اتصال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ناقص کامل میں مل کر بے نام و نشان ہو جایا کرتی ہے جیسے ایک بارش کا قطرہ

جب بحر بے پایاں سے اتصال پاتا ہے تو بے نام و نشان ہو جاتا ہے یا آگ، کا شعلہ اگر کسی ایسے غار میں جو آگ سے پر ہو ڈال دیا جائے تو اس آگ میں پڑ کر محو ہو جاتا ہے یا ایک مچھر کے اڑنے کی آواز جو طبل و بوق کی آواز کے سامنے بالکل غیر محسوس ہو جاتی ہے یا ایک چراغ کی روشنی جو نصف النہار میں ایک وسیع میدان میں جلا کر رکھ دیا جائے۔ الغرض محسوسات میں اس اصل کے کئی ایک نظائر موجود ہیں اسی طرح عقلیات میں بھی یہ اصل بجائے خود صحیح اور درست ہے ایک اونی شاگرد کا علم اپنے استاد کامل کے علم کے سامنے بالکل بے نمود ہوتا ہے اس لئے استاد اپنے شاگرد کی نسبت عظیم کہلانے کا مستحق ہے اسی طرح ایک شیخ اپنے مرید کی نسبت عظیم ہے اور جناب سردر کائنات تمام افراد امت سے عظیم ہیں اس اصل کے سمجھ لینے پر یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ کسی شخص کا عظیم ہونا یا تو دنیوی پہلو میں ہوگا اور وہ ظاہر ہے کیونکہ جس قدر اعتبارات دنیوی از قسم مال و منصب کسی کو حاصل ہوں گے اسی قدر وہ شخص عظیم سمجھا جائے گا یا دینی پہلو میں جس کی نسبت ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ من تعلم وعلم وعمل بما علم ثم علم الخير فذلك يدعى عظيما فى السماء یعنی جو شخص علم حاصل کر کے عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے گروہ ملائکہ میں اسے عظیم بولا جاتا ہے عارف کامل میں جب آثار بشریت مضمحل ہو جاتے ہیں اور انوار توحید مملکت قلب میں ظاہر ہونے لگتے ہیں تو وہ خود بے نام و نشان ہو کر بقاء ذات واحد حقیقی کے ساتھ زندہ ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے نام و نشان ہو کر خود واحد حقیقی بن جاتا ہے عبد ہر ایک مقام میں عبد ہی رہتا ہے ہاں اس کو ایک عقلی اور معنوی تقرب ذات حقیقی سے اس حد تک حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ظاہر و باطن میں مظہر صفات کاملہ ہو کر ان معارف و حقائق کا مالک ہو جاتا ہے جو عقول بشری کے انداز سے بالاتر ہیں اور اسی مقام پر خرق عادات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ عظیم وہ ذات ہے کہ جس کی عظمت اغیار

کی تعظیم پر موقوف نہ ہو اور جس کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانا ناممکن ہو اور بعض لکھتے ہیں کہ عظیم وہ ذات ہے جس کی عظمت کا کوئی آغاز نہ ہو اور نہ اس کے جلال کا کوئی انجام۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے عزت اور ہر مرض سے شفا ہو۔

دعاء

سبحان الله العظيم و اذا اجتهد فى الدعاء قال يا حيى يا قيوم (ترمذی)

اللهم سجدلك سوادى وخيالى وبك امن فوء ادى ابوء بنعمتك على وهذا ماجنيت على نفسى يا عظيم يا عظيم اغفرلى فانه لايغفر الذنوب العظيمة الا الرب العظيم. (حصن حصين)

الغفور

جل جلالہ

غفران مصدر سے مشتق ہے اور مبالغہ کا وزن ہے اور غفار اور غفور میں فرق یہ ہے کہ غفار کا مبالغہ کمیت فعل کے متعلق ہے یعنی باوجود بار بار گناہ کرنے کے مغفرت کرنے والا غفار ہے اور غفور کا مبالغہ کیفیت فعل کے متعلق ہے یعنی ایسی مغفرت جو اپنی خوبی و عمدگی میں غایت کمال تک پہنچ گئی ہو مزید تشریح کے لئے اسم غفار کی تفسیر کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

خاصیت

الغفور بخار والے کو تین بار لکھ کر باندھ دیا جاوے بخار جاتا رہے۔

دعاء

الحمد لله الذی ردالی نفسی ولم یمتهافی منامها الحمد لله الذی یمسك السموت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسكهما من احد من بعده انه كان حليماً غفورا الحمد لله الذی یمسك السمآء ان تقع علی الارض الا باذنه ان الله بالناس لروف رحیم۔ (حصن حصین)

الشکور

جل جلالہ

اس اسم کی تشریح میں چند ایک مسائل قابل تحقیق ہیں اول یہ کہ اسم شکور اسم فاعل (شاکر) کا صیغہ مبالغہ ہے جو مصدر شکر سے مشتق ہے اور اصل لغت میں اس کے معنی زیادتی کے ہیں چنانچہ شکیر الشجر درخت کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کو بولتے ہیں جو اس کی جڑ میں نکل پڑتی ہے اور ناقۃ شکیرۃ ایسی اونٹنی کو بولتے ہیں جس کا حوانہ دودھ سے پر ہو اور شکرت الارض اس وقت بولتے ہیں جب کسی زمین میں بہت سی نبات ہو قرآن مجید میں لفظ شاکر اور شکور ہر دو ذات باری کے لئے وارد ہوئے ہیں اور امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ شکور وہ ذات ہے جو طاعت قلیل کے عوض میں اجر کثیر اور چند روز زندگی کے اعمال کے مقابلہ میں نعیم ابدی عطا فرماوے اور جو شخص اپنے محسن کے احسان پر اس کی ثنا کہتا ہے تو وہ بھی اس کا شکر گذار کہلاتا ہے چنانچہ فرمایا من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ یعنی جو شخص کسی محسن آدمی کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن مجید کے اکثر مواقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک

بندوں کے اعمال حسنہ پر ثنا کی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ محض اس کی رحمت ہے اور در حقیقت وہ ثنا اس ذات مقدس کی ثناء سمجھنی چاہئے کیونکہ بندہ سے جو اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں وہ صرف اس کی توفیق کا نتیجہ ہیں اس لئے فی الحقیقت وہی ذات مقدس شکر کی مستحق ہے اور حق یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عہدہ شکر سے کبھی بری نہیں ہو سکتا کیونکہ توفیق شکر بجائے خود ایک نعمت ہے جس پر ادائے شکر واجب ہے اس لئے کسی ایک ہی نعمت کا سلسلہ شکر اس قدر طویل ہو جاتا ہے کہ انسان کی ساری عمر بھی ادائے شکر کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی چنانچہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا میں ہی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حصر نہیں ہو سکتا تو ان نعمتوں پر ادائے شکر کیسے متصور ہو گا اس لئے بہترین صورت ادائے شکر کی یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک حقیقی کی دی ہوئی نعمتوں کو خواہ بدنی ہوں یا مالی ظاہری ہوں یا باطنی معصیت میں صرف نہ کرے اور یہی شکر کے حقیقی معنی ہیں مگر یہ بات بھی توفیق خداوندی پر موقوف ہے۔

حقیقت شکر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے حقیقت کو سمجھ لیا جائے سو واضح ہو کہ نعمت ہر ایک ایسے امر کو بولتے ہیں جس سے انسان متمتع ہو سکتا ہو اب غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ نعمت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی چیز بھی عالم کائنات میں ایسی نہیں جس سے انسان متمتع نہ ہوتا ہو اس لئے بندہ کا شکر گذار ہونا یہ ہے کہ وہ اپنے افعال و اقوال میں ایسے احکام کا پابند ہو جو رضائے الٰہی پر مبنی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہونا یوں ہو گا کہ وہ ان افعال و اقوال پر بندہ کو جزائے خیر عطا فرماتا ہے اور چونکہ ہر ایک نعمت کا منعم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے حیث قال وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ اس لئے فی الحقیقت کوئی شخص مستحق شکر نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی عبد کا کسی غیر سے احسان کرنا انعام خداوندی پر موقوف ہے اگر وہ توفیق احسان نہ دیتا تو وہ کبھی احسان نہ کر سکتا اس لئے عبد ہر ایک حالت میں معزول ہے۔ اور اسے خیر و شر میں کچھ

دخل نہیں معہذا وہ اشیاء جن سے عبد احسان کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوتی ہیں اور اسی کی مملوک بھی ہیں اس لئے انسان خود کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا لہذا اس کا حقیقی احسان کرنا بھی ناممکن ہے عبد جب کسی سے احسان کرتا ہے تو اس پر معاوضہ کی امید رکھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے احسان کی یہ صورت نہیں کیونکہ وہ باوجود بندہ سے مستغنی ہونے کے اس پر احسان کرتا ہے اس لئے بندہ اگر اللہ تعالیٰ کا جو منعم حقیقی ہے ادائے شکر کرے تو یہ شکر اس کی نعمت کا معاوضہ نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ابوبکر واسطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شکر ایک قسم کا شرک ہے یعنی اگر بندہ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے مقابلہ پر ادائے شکر کرنے سے احسان کا مقابلہ احسان سے ہو جاتا ہے تو یہ خیال مشرکانہ ہے کیونکہ ذات باری تو اپنے عبد سے مستغنی ہے مگر عبد اپنے رب سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا اس لئے استغناء اور احتیاج کا کوئی مقابلہ نہیں عارف کا مقام شکر عوام الناس کے مقام شکر سے کہیں بالاتر ہے کیونکہ عوام الناس تو بذریعہ افعال اور اقوال کے ادائے شکر کیا کرتے ہیں اور ان کی نظر نعمت پر ہوتی ہے مگر عارف کامل نعمت سے ہٹ کر منعم کی طرف رجوع کیا کرتا ہے یعنی نعمت کو نظر انداز کر کے منعم کو اپنا مقصد حقیقی قرار دیتا ہے۔

یہ امر نہایت قابل غور ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے تئیں وصف شکر سے موصوف کیا ہے حالانکہ یہ مقام عارف کامل کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے محض اپنی رحمت کامل سے باوجو داستغناء ذاتی کے اپنے بندوں کے اعمال کو پایہ قبول بخشا ہے حالانکہ انسان کا وجود اور تمام اسباب جو ادائے شکر میں واسطہ بنتے ہیں اسی کے عطا کئے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام اہل تحقیق بالاتفاق مانتے ہیں کہ انسان ضعیف البنیان ہرگز ادائے شکر کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا ولنعم ماقیل۔

از دست وزبان کہ برآید   کز عہدہ شکرش بدر آید

کسی اور اہل دل نے کہا ہے۔

اگر ہر موئے من گردد زبانے　　ز تو رانم بہریک داستانے
نیارم گوہر شکر تو سفتن　　سر موئے ز احسان تو گفتن

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شکور وہ ذات ہے جو عطائے جزیل کرے اور قلیل سے قلیل اطاعت کو پایہ قبول بخشے

خاصیت

جس کو ضیق النفس یا تکان یا گرانی اعضا ہو اس کو لکھ کر بدن پر پھیر دے اور پیوے تو نفع ہو اور اگر ضعیف البصر اپنی آنکھ پر پھیرے نگاہ میں ترقی ہو۔

العَلِیُّ

جل جلالہ

قال اللہ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ یہ اسم مصدر علو سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں امام غزالی رحمتہ اللہ لکھتے ہیں کہ علی وہ ذات ہے جس کے رتبہ کے مقابلہ میں تمام مراتب پست ہیں سو جس طرح اشیاء محسوسہ میں بعض اجسام دیگر بعض کی نسبت بالاتر ہوتے ہیں اسی طرح اشیاء معقولہ (عقلیات) میں بھی مراتب ہیں یعنی بعض دیگر بعض کی نسبت اشرف اور اعلی ہوتے ہیں مثلاً علت اپنے معلول سے اور کامل بہ نسبت ناقص کے اشرف و اعلی سمجھا جاتا ہے اور یہ علو کسی بلند یا پست مکان کے لحاظ سے ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عقلی کے رو سے یہ نسبت ملحوظ ہوتی ہے اس اعتبار عقلی کی رو سے اگر ہم موجودات عالم کے مراتب کمال و نقصان کا موازنہ کرنے لگیں تو یقیناً ذات باری کو سب سے اعلی رتبہ میں پائیں گے کیونکہ وہ اپنے صفات کاملہ میں کسی غیر کا محتاج نہیں بر خلاف دیگر افراد موجودات کے جو باہم مدارج کمال میں متفاوت ہیں مگر سب کے سب ربوبیت ذات باری کے محتاج ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دوسری قسم کی موجودات حس و حرکت اور

قوت ارادہ اور ادراک سے بے بہرہ ہیں اس لئے وہ اسفل السافلین میں شمار کئے جاتے ہیں اور حیوانات مطلق گو حس و حرکت اور ارادہ رکھتے ہیں مگر ادراک معقولات سے عاری ہیں اس لئے پہلی قسم کی موجودات دوسری قسم سے اعلیٰ ہے مگر پہلی قسم میں پھر تقسیم عقلی جاری ہو سکتی ہے کیونکہ ذوی العقول یا تو شہوت و غضب رکھتے ہیں یا ان ہر دو سے عاری ہیں پہلی قسم حضرت انسان ہے جو ادراک معقولات کے ساتھ حیوانی لوازم مثلاً شہوت و غضب سے بھی متصف ہیں اور دوسری قسم میں پھر تقسیم جاری ہو گی کیونکہ ایسے ذوی العقول جو شہوت و غضب سے عاری ہیں اگر ان کا غضب و شہوت سے متصف ہونا ممکن ہو تو وہ ملائکہ ہیں اور اگر ناممکن ہو تو وہ ذات باری ہے اس لئے اس تقسیم در تقسیم سے یہ نتیجہ نکلا کہ تمام موجودات میں بلحاظ کمال کے جمادات اسفل السافلین میں ہیں اور ان سے اعلیٰ حیوانات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ حضرت انسان اور حضرت انسان سے اعلیٰ ملائکہ کرام اور ملائکہ کرام سے اعلیٰ ذات باری عزاسمہ جو کامل مطلق اور اس لئے سب سے اعلیٰ ہے اس تقسیم میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اجسام میں عرش عظیم سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ وہ تمام اجسام کا محدد ہے اور وہ خود کسی چیز سے محیط نہیں یہی وجہ ہے کہ ذات باری تمام موجودات سے بالاتر ہے مگر قرآن مجید میں عرش سے بالاتر ہونا ظاہر فرمایا کیونکہ عرش تمام موجودات عالم سے بالاتر ہے اور یہ فوقیت ذات باری کی مکانی نہیں بلکہ عقلی ہے کیونکہ جس طرح دو شخص صدر مجلس میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں تو یہی کہنا پڑے گا۔ کہ ہر دو میں سے ایک دوسرے سے اعلیٰ ہے حالانکہ اعلیٰ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسرے کے سر پر بیٹھا ہے بلکہ یہی کہنا پڑے گا کہ ایک کا درجہ دوسرے سے اعلیٰ ہے یہی عقلی علو ذات باری کی نسبت سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ بلحاظ کمالات کے تمام موجودات سے بالاتر ہے یہیں سے یہ نکتہ بھی کھل جائے گا کہ عبد کبھی علی مطلق نہیں ہو سکتا کیونکہ گو وہ دیگر موجودات سے کمالات میں بڑھ جائے جیسے ذات بابرکات جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ

وسلم مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی مخلوق ذات باری کا رتبہ پا کر علی مطلق بن جائے آیۃ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ اور آیۃ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ میں اسی فوقیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ علو ذات باری کی تین توجیہات ہو سکتی ہیں اول یہ کہ کوئی موجود شرف و عزت میں اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا دوم یہ کہ وہ تمام موجودات پر قدرت تامہ رکھتا ہے اور سب کے سب اس کے مقہور و مغلوب ہیں سوم یہ کہ وہ تمام امور میں حسب مشیت ازلی متصرف ہے اور کوئی امر اس کی مشیت کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ علم و قدرت و طہارت میں سب سے فائق ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو تمام ماسوائے اللہ کے استغناء کلی حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے مگر عوام الناس ایسے انسان کی شناخت سے عاجز ہوتے ہیں۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ علی وہ ذات ہے جو ادراک سے بالاتر ہو اور جس کے صفات احاطہ تصور سے خارج ہوں۔

خاصیت

اگر لکھ کر بچے کے باندھ دیا جاوے جلدی جوان ہو اگر مسافر اپنے پاس رکھے تو جلدی اپنے عزیزوں سے آملے اگر محتاج ہو تو غنی ہو جاوے۔

الْكَبِيْرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ اور پھر فرمایا وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس مادہ سے ذات باری کے متعلق شریعت میں تین اسم وارد ہوئے ہیں کبیر متکبر اکبر آخر کا اسم قرآن میں صفات (قال اللہ تعالیٰ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ اور پھر فرمایا وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ) کے متعلق وارد ہوا ہے نہ ذات باری کی نسبت البتہ احادیث سے اللہ اکبر بتواتر ثابت ہوتا ہے۔

اسم کبیر کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں اول تو یہ کہ یہ اسم صغیر کے مقابل میں واقع ہوا ہے مگر صغیر و کبیر بسا اوقات اجسام کی صفت میں واقع ہوتے ہیں لیکن ذات باری مقدار سے بالاتر ہے اس لئے اس کا کبیر ہونا بلحاظ حجم اور مقدار کے نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی صغیر و کبیر کو عقلی مدارج کے لحاظ سے بھی اعتبار کیا کرتے ہیں چنانچہ سردار قوم کو کبیر القوم اور ایک بڑے صاحب علم کو کبیر فی الدین بولا کرتے ہیں اور ہر دو میں ان کے درجہ عالیہ کا لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید کی آیۃ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمْ میں یہی معنی مراد ہیں چونکہ ذات باری عزاسمہ صفات ذاتیہ میں تمام موجودات سے اکمل و اشرف ہے اس لئے تمام اشیاء

موجودات کی نسبت وہ کبیر ہے اور تمام موجودات بمقابلہ اس کی ذات کے صغیر دوم کبیر ہونا ذات باری کا اس جہت سے ہے کہ وہ مخلوقات کی مشابہت سے برتر ہے اس صورت میں بصلہ عن ماخوذ ہو گا یقال کبر عنہ اس لئے توجیہ یوں ہو گی هو كبير عن مشابهة الخلق یعنی وہ موجودات کی مشابہت سے برتر ہے ہر دو توجیہ کے رو سے یہ اسم منجملہ اسماء تنزیہ کے ہے۔

اسم اکبر کی بھی دو توجیہ ہو سکتی ہیں اول هو اكبر من كل ماسواه یہ توجیہ جملہ اللہ اکبر کے شروع نماز میں قائم کرنے کی حکمت کو واضح کر دیتی ہے کیونکہ جب مصلی کو یہ علم ہو کہ وہ ذات مقدس جس کے حضور میں کھڑا ہے تمام موجودات سے اکمل و اشرف ہے تو اس کی توجیہ کسی غیر اللہ کی طرف مصروف نہیں ہوتی مگر مبرد جو امام لغت عربیہ ہیں لکھتے ہیں کہ یہ توجیہ صحیح نہیں کیونکہ یہ لفظ جو صیغہ افعل تفضیل ہے ایسی دو چیزوں کے درمیان استعمال کیا جاتا ہے جن میں مشابہت اور مجانست ہو اور ایک دوسری کی نسبت وصف کبر میں بڑھی ہوئی ہو مگر اللہ تعالیٰ اور موجودات میں کسی قسم کی مشابہت اور مجانست نہیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگ موجودات میں سے غیر اللہ کی بھی تعظیم و تکریم حقیقی کا اہل نہیں ہو سکتا اور ابو عبیدہ کہتے ہیں اکبر اس جملہ میں معنی کبیر کے ہے یعنی صیغہ افعل کے معنی میں مستعمل نہیں اور ایسا استعمال اہل زبان میں جاری ساری ہے اور وہ فرزدق کا شعر ذیل سند اپیش کرتے ہیں حیث قال۔

ان الذی سمك السماء بنی لنا
بیتاً دعا ئمه اعزو اطول

اس شعر میں اعز اور اطول بمعنی عزیز و طویل مستعمل ہوئے ہیں۔ (یعنی وہ ذات جس سے آسمان کو بلند کیا اس نے ہمارے لئے ایک گھر (شرافت کا گھر) بنایا ہے جس کے ستون بڑے مضبوط اور طویل ہیں۔)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبریاء سے مراد کمال ذات کے اور

کمال ذات سے کمال وجود مراد ہے اور کمال وجود سے دو چیزوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اول یہ کہ وہ وجود ازل سے ابد تک پائدار ہو اور اگر کوئی وجود ایسانہ ہو بلکہ اس کے اول وآخر میں اس کا عدم تجویز کیا جا سکے تو وہ ناقص ہو گا یہی وجہ ہے کہ کسی بڑی عمر کے آدمی کو کبیر السن بولا کرتے ہیں نہ عظیم السن سوجب ایک محدود البقاانسان کو کبیر بول سکتے ہیں تو غیر محدود البقابدرجہ اولے کبیر ہو گا۔

دوم کمال وجود سے یہ مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی وجود تمام دیگر موجودات کا منبع قرار پا سکے سو بجز ذات باری اور کوئی موجود ایسا نہیں ہو سکتا۔

عظمت اور کبریاء گو بظاہر ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں مگر ہر دو میں فرق ہے حدیث قدسی الکبریاء ردائی والعظمة ازاری میں اسی فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کبریاء عظمت کی نسبت زیادہ عظیم الشان وصف ہے یہی وجہ ہے کہ کبریاء کو رداء اور عظمت کو ازار سے تعبیر کیا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کے صفات کمال کے آثار دوسرے لوگوں تک پہنچ جائیں اور جو اس شخص سے مجالست کرے وہ اس کے فیضان کمال سے بے بہرہ نہ رہے اور انسان کو درجہ کمال اس وقت حاصل ہوا کرتا ہے۔ جب اس کی عقل پرہیز گاری علم درجہ کمال تک ترقی کر جاتے ہیں لہذا نوع انسان میں کبیر وہ شخص ہوا کرتا ہے جو عالم تقی صاحب ارشاد ہو اور لوگ اس کے فیض علوم سے مستفیض ہوں ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ علماء سے مجالست اور حکماء سے مصاحبت اور کبراء سے مخالطت رکھو علماء علوم شرعیہ کے محافظ ہیں حکماء اسرار معرفت کے جامع ہوتے ہیں اور کبراء ہر دو منصب کی قابلیت رکھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو آفتاب عالم تاب کی طرح خود روشن ہو کر درو بام عالم کو اپنے انوار سے روشن کر دیتے ہیں اور ان کا وجود بہت نادر ہوتا ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے باب علم و معرفت کشادہ ہو اور اگر کھانے کی چیز پر پڑھ کر زوجین کو کھلایا جائے تو باہم الفت ہو۔

الحَفِیظُ

جل جلالہ

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حفیظ مبالغہ ہے اسم حافظ کا اور حافظ کا مفہوم حقیقت حفظ کے سمجھ لینے پر موقوف ہے سو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول وجود موجودات کو لگاتار جاری رکھنا اس کی متضاد حالت کا نام معدوم کر دینا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ تمام موجودات کا خواہ زمینی ہو یا آسمانی حافظ ہے دو متضاد اشیاء کو اپنی اپنی حد میں محدود رکھنا اور ایک کو دوسرے پر غلبہ پانے سے روکنا مثلاً حرارت کو برودت سے اور رطوبت کو یبوست سے علیحدہ علیحدہ تعدی سے محفوظ رکھنا غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ترکیب بدن میں ہر چہار متضادہ کیفیات کو کس حکمت بالغہ سے جمع کیا ہے اگر ایک ان میں سے غالب آجائے تو زندگی باطل ہو جاتی ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک غلبہ پانے لگے تو بذریعہ غذا اور دوا کے اس کو روکا جا سکتا ہے یہ تو اندرونی سلسلہ اسباب ہے جس سے انسان کی زندگی قائم رہ سکتی ہے رہا بیرونی طور پر انسان کی حفاظت کا سلسلہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ کس قدر اسباب ہمارے چاروں طرف ایسے موجود ہیں جن کے استعمال سے انسان اپنی زندگی کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور یہ سب اس حافظ حقیقی کی عنایت

ازلی کا نتیجہ ہے نباتات کو دیکھو کہ ان کے محفوظ رکھنے کے لئے کس قدر اسباب مناسبہ پیدا کر دیئے ہیں اگر ان کی تفصیل کرنے لگیں تو انسان کی عمر ہرگز مکتفی نہیں ہو سکتی اگر ہم اس سلسلہ اسباب کی وسعت پر غور کریں جو تمام ذرات موجودات کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہے تو عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کبھی حفظ بمعنی ضد تضییع بھی مستعمل ہوتا ہے مثلاً حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى لاتهملوها ولاتضيعوها چنانچہ آیۃ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَالْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ میں یہی معنیٰ ملحوظ ہیں اور آیۃ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں بھی یہی معنیٰ زیادہ چسپاں ہیں کیونکہ کلام الٰہی کو تحریف و تبدیل سے بذریعہ اسباب مناسبہ کے محفوظ رکھنا اس کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔

اگر ہم اپنے دینی حالات میں غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک آن کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے باہر نہیں جا سکتے بڑے بڑے عقلاء روزگار جو دنیا بھر کے علوم و فنون میں یگانہ تھے دین کے معاملہ میں صرف ایک ہی شبہ یا اشکال کے پیش آنے پر گمراہ ہو جاتے رہے اور عمر بھر ورطہ ضلالت سے نہ نکل سکے لیکن اگر کسی کو حفاظت الٰہی ایسے ورطہ میں مبتلا ہونے سے بچا لے تو وہ محفوظ رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ادعیہ قرآنیہ میں وارد ہوا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اس دعاء میں حفاظت الٰہی کی استدعا کی گئی ہے اور آیت لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنَاكَ اور نیز آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ میں بھی اسی حفاظت کی طرف اشارہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جب ہم دنیوی حالات میں غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے چاروں طرف اسباب ہلاکت موجود ہیں مگر اس نے ہمیں ان کے دفع کے اسباب بھی عطا فرما دیئے ہیں چنانچہ ہماری حفاظت کے لئے ملائکہ متعین ہیں قال اللہ تعالیٰ لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ

امراللہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ عقلی طور پر بھی ذات باری کا حافظ ہونا ثابت ہے کیونکہ جس طرح تمام ممکنات عدم سے وجود میں آنے کے لئے کسی مرجح کی محتاج ہے اسی طرح موجود ہو کر اپنے وجود کے قائم رکھنے میں بھی حفاظت کی محتاج ہے اس لئے صرف ذات باری ہی محافظ ہو سکتی ہے چنانچہ آیت اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے دو طرح بہرہ حاصل ہوتا ہے اول قوت نظری کی رو سے جس کی صورت یہ ہے کہ وہ بدعات اور شکوک اوہام سے اپنے اعتقادات حقہ کو محفوظ رکھے دوم قوت عملی کی رو سے جس کی صورت یہ ہے کہ شہوت و غضب کی اطاعت سے اپنے اعضاء اور قوی کی نگہداشت کرے اور اصل عظیم دربارہ حفاظت علم و عمل کے یہ ہے کہ صراط مستقیم شریعت کی شناخت کرے جس کی استدعا پانچ وقت نماز میں کی جاتی ہے کیونکہ یہی صراط مستقیم قیامت کے دن پل صراط کی صورت میں جہنم کے اوپر کھینچا جائے گا جس پر چلنا اس موجودہ زندگی کے علم و عمل کی خوبی پر منحصر رکھا گیا ہے ہر ایک ایماندار کا فرض ہے کہ آج حسن اعتقاد اور حسن عمل کی حقیقت میں غور کر کے اصلاح کرے کیونکہ آج کی اصلاح در حقیقت مابعد الموت کی اصلاح ہے۔

امروز۔ دراں کوش کہ بینا باشی
حیران جمال آں دلارا باشی
شرمت بادا چو کودکان در شب عید
تاچند در انتظار فردا باشی

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ حفیظ وہ ذات ہے جو بندہ کو مصیبت کی حالت میں اظہار شکایت سے اور امن و عافیت کی حالت میں امتحان سے محفوظ رکھے بعض لکھتے ہیں کہ حفیظ وہ ذات ہے کہ اپنے بندہ کے باطن کو ملاحظہ اغیار سے اور ظاہر کو موافقت فجار سے محفوظ رکھے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اعضاء اور قوی کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے باطن کو ہر ایک قسم کے وساوس و شکوک سے محفوظ رکھتا ہے اور جب بندہ اس مقام میں استقامت حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اہل عالم کے لئے حجۃ اللہ کا منصب عطا فرماتا ہے۔

خاصیت

اس کا ذکر کرنے والا یا لکھ کر پاس رکھنے والا ہر خوف سے محفوظ رہے اگر درندوں کے درمیان سو رہے تو ضرر نہ پہنچے۔

اَلْمُقِیْتُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا اس اسم کی تشریح میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مقیت بمعنی مقتدر ہے اور وہ ایک اہل زبان کے شعر ذیل کو حجت میں پیش کرتے ہیں ۔

وذی ضغن کففت النفس عنه
وکنت علی مساءته مقیتاً

یعنی کئی ایک کینہ توز دشمن ہیں جن کے مقابلہ سے میں نے اپنے تئیں روکا حالانکہ میں ان کی بدسلوکی پر پوری قدرت رکھتا تھا ازہری شمر سے راوی ہیں کہ مقیت خاص لغت قریش کا لفظ ہے دوم وہ ذات جو مخلوق کے قوت بہم پہنچانے کی متکفل ہے فراء نحوی کہتے ہیں کہ قاتہ اور اقاتہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں سوم یہ کہ مقیت مشتق ہے اقات علی الشی سے جس کے معنی ہیں شہد علیہ کے چہارم ابو عبیدہ معمر بن مثنی کہتے ہیں کہ مقیت بمعنی حفیظ ہے امام غزالی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مقیت میں قدرت و علم ہر دو کا مفہوم

شامل ہے اس لئے یہ اسم قادر اور علیم ہر ایک سے زیادہ وسیع ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مقیت وہ ذات ہے جو اپنے بندہ کی مناجات کی اجابت فرمائے اور مصیبت و بلا کو دفع کرے بندوں کے قوت مختلف قسم کے ہیں اکثر تو مطعومات سے زندہ رہتے ہیں اور بعض ذکر الٰہی سے اور خواص العباد کے لئے مکاشفات و مشاہدات بمنزلہ غذا کے ہیں حدیث ابیت عند ربی یطعمنی و یسقین (یعنی میں اپنے رب کے پاس رات بسر کرتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے) میں اس غذاء کی طرف اشارہ ہے۔

خاصیت

اگر روزہ دار اس کو مٹی پر پڑھ کر یا لکھ کر اس کو تر کر کے سونگھے تو قوت اور غذائیت حاصل ہو اور اگر مسافر کوزہ پر سات بار پڑھ کر پھر اس سے پانی پیا کرے وحشت سفر سے مامون ہو۔

الحَسِيبُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا اس اسم کی تفسیر کے متعلق چند وجوہ بیان کئے گئے اول یہ کہ حسیب بمعنی کافی ہے اور چونکہ فعیل کا وزن مفعل کے معنے میں مستعمل ہے جیسے بدیع بمعنی مبدع اور الیسم بمعنی مؤلم اسی طرح حسیب بمعنی محسب سمجھنا چاہیے اہل عرب بولتے ہیں۔

نزلت فلان فاكر منی واحسبنی ای اعطانی ماكفانی حتی قلت حسبی ومنه قوله تعالیٰ يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ یہ امر بالخصوص قابل ذکر ہے کہ ہر ایک امیر میں کفایت کا منصب بجز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں اگر بذریعہ اسباب مناسبہ کے کفایت حاصل ہو تو اسے بھی کفایت الٰہی کہنا چاہیے کیونکہ سلسلہ اسباب اسی کا مخلوق ہے لہذا ہر ایک قسم کی کفایت فی الحقیقت ذات باری کا حق ہے اس لئے کافی حقیقی وہی ذات واحد لاشریک ہے نہ کوئی اور یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس صورت میں کافی صرف ذات باری ہے تو آیت يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ کے کیا معنے ہوں گے کیونکہ اس آیت میں تحسب یعنی کافی ہونا ذات باری اور اہل ایمان ہر دو

کی طرف نسبت کیا گیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں دو مذہب ہیں اور ہر دو قواعد عربیت کی رو سے صحیح ہیں اگر من اتبعك کا عطف لفظ اللہ پر کریں تو معنی یہ ہوں گے کہ اے نبی تجھے اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کافی ہیں اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراض لازم آتا ہے اور اگر اس کا عطف حرف کاف پر کریں تو پھر اعتراض لازم نہیں آتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تجھے اور اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کافی ہے ان ہر دو معنی کو مفسرین نے قلمبند کیا ہے شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ عطف ضمیر کاف پر راجح اور قوی ہے امام رازی بھی اپنی کتاب لوامع میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی روایت کو نقل کرتے ہیں اور حافظ ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد کے شروع میں کئی ایک وجوہ اس روایت کی تقویت میں بیان کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان حضرات کو صرف اس خیال نے اس توجیہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ نسبت کفایت کی غیر اللہ کی طرف صحیح نہیں ورنہ عطف من اتبعك کا اسم اللہ پر ہی صحیح مذہب ہے اور یہ خیال کہ نسبت کفایت کی غیر اللہ کی طرف لازم آتی ہے قوی نہیں کیونکہ نسبت ذات باری کی طرف حقیقی ہے اور اہل ایمان کی طرف مجازی اور قرآن مجید میں ایسی کئی ایک آیات ہیں جن میں ایک فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ اور رسول اکرمؐ اور اہل ایمان کی طرف کی گئی ہے مگر ہر سہ کی نوعیت ایک نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ اعتبار سے مع ھذا جب ہم آیت يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ کے سیاق و سباق پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مذکورہ بالا دعوے بالکل صحیح ہے کیونکہ اس سے پہلے الفاظ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ اس کی تائید کے لئے کافی شہادت ہیں۔

دوم حسیب بمعنی محاسب ہے جیسے ندیم بمعنی منادم اور جلیس بمعنی مجالس چنانچہ آیت كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا میں حسیب بمعنی محاسب ہی موزوں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں سے قیامت کے دن حساب لے گا جن میں سے بعض کی نسبت تو حساب یسیر (آسان) اور بعض کی

نسبت حساب شدید لینے کا حکم وارد ہوا ہے۔

سوم حسیب بمعنی شریف ہے اس صورت میں حسب بمعنی شرف سے مشتق ہو گا۔ معنی یہ ہوں گے کہ حسیب وہ ذات ہے جو حقیقی مجد و شرافت اور اعلی جلال و کمال کے صفات سے متصف ہو۔

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ حاصل ہوتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر حسیب بمعنی کافی ہو تو اسی صورت میں حسیب وہ شخص ہو گا جو اہل حاجت کی حاجت روائی کے لئے بظاہر سبب بنے اور اگر حسیب بمعنی محاسب ہو تو حسیب وہ شخص ہو گا جو اپنا محاسبہ آپ کرتا ہے اور انسان کا آپ اپنا محاسبہ کرنا کمال نفس کی دلیل ہے اور بجز اہل معرفت کے دوسروں کو نصیب نہیں ہوتا ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے حاسبو انفسکم قبل ان تحاسبوا یعنی (قیامت کو) حساب لئے جانے سے پہلے آپ اپنا محاسبہ کیا کرو اور اگر حسیب بمعنی شریف ہو تو اس صورت میں حسیب وہ شخص ہو گا جو معرفت اور طاعت خداوندی میں استقامت حاصل کر لے کیونکہ اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کوئی شرف نہیں ہو سکتا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جو اپنے بندہ کے انفاس کا شمار کیا کرے اور اپنے خوف و عذاب کو اس سے روک دے بعض لکھتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جس کی خیر کی امید اور جس کے شر سے امن حاصل ہو بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ حسیب وہ ذات ہے جو اپنے فضل سے بندہ کو کافی ہو اور اپنے احسان سے آفات کو روک دے اور بعض یوں فرماتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جو اہل حاجت کی التجاء پر ان کی حاجت روائی کرے اور کسی حکم کو نہایت استحکام کے ساتھ جاری فرماوے۔

خاصیت

اگر کسی سے تشدد حساب کا اندیشہ ہو یا کسی بھائی برادری سے کسی معاملہ میں خوف ہو تو سات روز تک قبل طلوع آفتاب و بعد مغرب اس کو ٧٠ مرتبہ پڑھا کرے۔

اَلْجَلِیْلُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا اور اس کے معنی صاحب جلال کے ہیں البتہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے ویبقی وجه ربك ذوالجلال والا کرام اس آیہ میں ذات باری کے لئے دو قسم کے صفات کا ذکر ہے یعنی ذوالا کرام سے صرف ذات کامل کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے مگر ذوالجلال سے مراد کامل الذات والصفات ہے اور صفات دو قسم کے ہیں اول صفات سلبیہ یعنی ایسے صفات جن سے ذات باری پاک ہے مثلاً مثل یا نظیر یا مکان و زمان وغیرہ سے بالاتر ہونا دوم صفات ثبوتیہ جو ذات باری کے لئے ثابت ہیں مثلاً علم و قدرت وغیرہ۔

اس قدر تشریح کے بعد لفظ جلیل کی لغوی تحقیق یوں ہے کہ فعیل بمعنی مفعل (اسم فاعل) مستعمل ہے اس لئے جلیل بمعنی مجل ہو گا یعنی ایسی ذات جو اہل ایمان کو اعزاز و اکرام بخشے اور ان کے ثواب کو عظیم بنائے اور بمعنی فاعل بھی صحیح ہے اس لئے اس کی توجیہ یوں ہو گی کہ جلیل وہ ذات ہو گی جو تمام صفات جلال سے بروجہ کمال موصوف ہو اور بمعنی مفعول بھی جائز ہے توجیہ یوں ہو گی کہ جلیل وہ ذات ہے جو اس امر کی مستحق ہو کہ عقلاء اس کے

جلال و کبریاء کا اعتراف کریں اور اس کی الوہیت کا انکار نہ کریں۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ تمام عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سے بری ہو کر معارف حقہ اور اخلاق فاضلہ سے متصف ہو جاتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جلیل وہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف قصد کر کے آئے عزت پائے اور جو اس کی مخالفت اور تحقیر کرے ذلیل ہو بعض لکھتے ہیں کہ جلیل وہ ہے جو اہل معرفت کے دلوں میں جلیل القدر اور اہل محبت کے دلوں میں بلند رتبہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ جلیل وہ ذات ہے جس کے علو صفات کی وجہ سے کوئی اس پر غالب نہ آسکے اور جس کے کبریاء کی وجہ سے کوئی شخص اس کے کمال جلال کا ادراک نہ کر سکے اور بعض نے لکھا ہے کہ جلیل وہ ذات ہے جو قلوب محبین کو وصف جلال اور نعت جمال سے مکاشفہ کا مقام عطا فرمادے اور بعض فرماتے ہیں کہ جلیل وہ ذات ہے جو اولیاء کو اپنے فضل سے عزت بخشے اور اعداء کو اپنے عدل سے ذلیل کر دے۔

واضح ہو کہ جلال و جمال ہر دو صفات باری کی قسمیں ہیں اور ہر دو مظاہر عالم میں جلوہ افروز ہیں جلال میں صفات قہر و سطوت وغلبہ اور جمال میں صفات رحمت مغفرت احسان داخل ہیں گو ہر دو ایک ہی ذات مقدس کے آثار ہیں مگر مختلف موارد کے لحاظ سے عالم کائنات میں ان سے مختلف نتائج ظہور میں آتے رہتے ہیں جس طرح وہ ذات احدیت جلال کی مالک ہے اسی طرح جمال بھی اسی کی وصف ہے وہی قوت غالبہ کی مستحق ہے اور وہی ہر ایک قسم کے انعام کی منبع ہے اور وہ جمیل مطلق ہے اور اسی لئے اس کے حسن ذاتی کا ادراک محال عقلی ہے جس طرح اہل ظاہر اشیاء کے حسن ظاہری پر دلدادہ ہوتے ہیں اسی طرح اہل بصیرت حقائق اشیاء کی خوبی پر محو حیرت ہوتے ہیں اور ان کے قلوب پر تجلیات جلال و جمال کا ہر وقت ورود ہوتا ہے تجلیات جلال کا اثر خشیت و خشوع ہے اور تجلیات جمال کا محبت وانس

کشتگان خنجر تسلیم

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

خاصیت

اس کو بکثرت ذکر کرنے سے یا مشک و زعفران سے لکھ کر پاس رکھنے سے قدر و منزلت زیادہ ہو۔

اَلْکَرِیْمُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ اور پھر فرمایا اقرا وربک الاکرم واضح ہو کہ اہل عرب ہر ایک صفت محمود کو کرم سے تعبیر کیا کرتے ہیں ایک حدیث میں وارد ہوا ہے یوسف اکرم الناس اس جملہ میں کرم سے کرم نسب مراد ہے اہل عرب بولتے ہیں فلاں کریم الطرفین کبھی اس لفظ کا اطلاق صورت حسیہ پر بھی آتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ اور جنت کی وصف میں فرمایا مقام کریم کبھی اس لفظ کا اطلاق بمعنے عزیز کیا کرتے ہیں چنانچہ آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ میں اکرم بمعنی اعز ہے سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کو کتاب کریم کہا گیا ہے کیونکہ ایک جلیل القدر مضمون پر مشتمل تھا جس کے منافع بیشمار تھے اسی لئے بڑی دودھیل اونٹنی کو بھی ناقہ کریمۃ بولا کرتے ہیں درخت انگور کو کرمہ بولنا بھی اسی خیال پر مبنی ہے کیونکہ وہ کثیر المنافع اور باسانی درخت سے اتارا جا سکتا ہے۔

اس لغوی تشریح کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ کرم بمعنی شرف و طہارت بجز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں کیونکہ وہی موجود حقیقی واجب

الوجود عدم اور دیگر نقائص سے منزہ و مبرا ہے اور اگر کرم بمعنی عزت ہو تو اس صورت میں بھی عزیز بجز ذات باری کے کوئی اور موجود نہیں ہو سکتا اور اگر کثیر المنافع ہونا مراد ہو تو ظاہر ہے کہ یہ وصف بھی بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں جو ہر ایک قسم کی خیرات کا مصدر ہے اور ذات باری کے کرم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ وہ بلا استحقاق اور بلا سوال اپنے خیر و احسان سے امتیاز بخشتا ہے اور اگر کوئی داعی یا کریم العفو کہہ کر اسے پکارے تو وہ اس داعی کے گناہ کو مٹا کر نیکی کو اس کے نامہ اعمال میں ثبت فرماتا ہے اور دنیا میں اپنے بندوں کے عیوب پر پردہ پوشی کرتا ہے اور مغفرت عطا فرما کر ان کے گناہوں کو انہیں یاد نہیں دلاتا اور اگر وہ تھوڑی سی طاعت بھی بجا لائیں تو انہیں ثواب جزیل عطا فرماتا ہے اور اس کے کرم پر مبنی ہے کہ اس نے تمام اشیاء کو انسان کی خاطر پیدا کیا اور دار آخرت کو جس کی وصف میں وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ وارد ہوا ہے تیار کر کے گوناگوں نعمتوں کا وعدہ فرمایا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو صاحب قدرت ہو کر عفو کرے اور وعدہ کر کے وفا کرے اور زائد از امید عطا فرمائے اور جب دے تو اسے ہرگز یہ پروا نہ ہو کہ کس قدر دیا ہے اور کس کو دیا ہے اور کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے سے ناراض ہو اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کے لئے کسی وسیلہ یا شفیع کو جائز نہ رکھے اور اپنے ہاں پناہ لینے والے کو اپنی نصرت سے محروم نہ کرے سو جس ذات کے لئے یہ تمام صفات مجتمعاً حاصل ہو جائیں وہ کریم کہلانے کی مستحق ہے ایسی ذات بجز ذات باری کے کوئی اور نہیں ہو سکتی اس لئے کریم مطلق صرف وہی ذات ہے پھر فرماتے ہیں کہ بندہ کو محنت و مشقت کے کسی قدر یہ صفات حاصل ہو سکتے ہیں اس لئے اسے بھی کریم بولا کرتے ہیں لیکن بمقابلہ ذات باری یہ صفات نہایت ناقص ہیں مگر انسان کریم وہی ہے جو مجرموں کے قصور کو معاف کر دے اور اصناف خلائق کو ہر ایک قسم کی

منفعت سے مستفید کرے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو بلا اظہار منت احسان کرے اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو بندہ کو کسی وسیلہ کا محتاج نہ رہنے دے اور بعض لکھتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو اہل عصیان کو قبول توبہ سے ناامید نہ کرے حارث محاسبی کہتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو اس امر کی پرواہ نہ کرے کہ کس کو دیتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو باوجود عصیان کے احسان کرے اور بعض نے اور بھی توجیہات لکھی ہیں۔

خاصیت

سوتے وقت بکثرت پڑھا کرے تو لوگوں کے قلب میں اس کا اکرام واقع ہو۔

دعاء

اعوذ بوجه الله الكريم النافع وبكلمات الله التامات التى لايجاوزهن بر ولا فاجر من شرما خلق وذراء وبراء ومن شرما ينزل من السمآء ومن شرما يعرج فيها ومن شر ماذرافى الارض ومن شر مايخرج منها ومن شر فتن الليل والنهار ومن شركل طارق الا طارقاً يطرق بخير يارحمن ۔ (حصن حصين)

الرَّقِیبُ

جل جلالہ

قال الله تعالىٰ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ اور پھر فرمایا وكان الله على كل شى رقيباً اس اسم کی توجیہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ رقوب کے معنی ہیں کسی چیز کو دواماً بطور حفاظت زیر نظر رکھنا اور آدمیوں میں رقیب ایسے شخص کو بولتے ہیں جو کسی چیز کی حفاظت پر موکل ہو اس طرح پر کہ وہ اس سے کسی حال میں بھی غفلت کو جائز نہ رکھے يقال رقبت الشى ارقبه اذا راعيته و حفظته قال الله تعالىٰ مَايَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّالَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ" اس آیت میں رقیب سے وہ فرشتہ مراد ہے جو بندوں کے نامہ اعمال کو لکھتا اور ان کے الفاظ کو محفوظ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رقیب ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ ان کے افعال و اقوال کو دیکھتا اور ان کا علم رکھتا ہے قال الله تعالىٰ اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى اور پھر فرمایا يَعْلَمُ مَافِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ دوم یہ کہ ارتقاب بمعنی انتظار ہے قال الله تعالىٰ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُرْتَقِبُوْنَ چونکہ انتظار ذات باری کے لئے محال ہے اس لئے اس کے لازم

معنی یعنی طلب مراد ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ادائے حق عبودیت کا طالب ہے اس لئے وہ رقیب ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس رقیب کے معنی العلیم الحفیظ کے ہیں یا یوں کہو کہ اس رقیب کا مفہوم علم و حفظ پر مشتمل ہے مگر بطریق دوام و لزوم نہ مطلق علم و حفظ پر اور عبد کا کمال وصف مراقبہ میں یہ ہے کہ وہ اس امر کا یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک امر میں اس کا پاسبان شاہد حال ہے اور نفس و شیطان ہر دو اس کے دشمن ہیں جو اس کی گھات میں لگے ہیں اور غفلت و مخالفت پر برانگیختہ کرتے رہتے ہیں انسان کامل کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے مکائد سے کبھی غافل نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت ان کی روک تھام کے لئے مستعد رہتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مراقبہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو قلب کے اندرونی حالات اور کیفیات کا علم ہو ان کیفیات و حالات کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہنا ہی مراقبہ ہے اور یہ مراقبہ تمام کمالات خیر و سعادت کا زینہ ہے اور یہ بات اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے تمام اقوال و افعال سے آگاہ ہے اور وہ ان پر محاسبہ کرے گا یہ یقین جب غالب ہو جاتا ہے تو بندہ سے گناہ کا ارتکاب نہیں ہوتا چنانچہ عبد اللہ بن عمر کی نسبت مروی ہے کہ انہوں نے ایک غلام کو بکریاں چراتے دیکھا آپ نے اس سے کہا کہ ایک بکری میرے پاس بیچ ڈالو اس نے کہا کہ بکریاں میری نہیں آپ نے کہا کہ تم کہہ دینا کہ بھیڑیا پھاڑ گیا ہے اس نے جواب دیا کہ خدا کہاں ہے؟ یہ قول آپ کے دل میں ایسا موثر ہوا کہ اس کے آقا سے خرید کر آزاد کر دیا کہتے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ غلام کا جواب یاد آیا کرتا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو باطن کے اسرار سے قریب اور عند الاضطرار مجیب ہو بعض لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو تمام ضمائر و مخفیات پر مطلع اور شاہد ہو بعض لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو تمام

حادثات کو ان کے وجود سے پہلے ہی جانتا اور دیکھتا ہو۔

خاصیت

اس کے ذکر کرنے سے مال و عیال محفوظ رہے اور جس کی کوئی چیز گم ہو جائے اس کو بہت پڑھے تو ان شاء اللہ تعالیٰ مل جاوے اور اگر اسقاط حمل کا اندیشہ ہو تو اس کو سات مرتبہ پڑھے اور ساقط نہ ہو اور سفر کے وقت جس بال بچہ کی طرف فکر ہو اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر سات مرتبہ پڑھے تو مامون رہے۔

المُجِیبُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ اس اسم کی دو طرح پر تفسیر کی گئی ہے اول تو یہ کہ اجابت بمعنے کلام ہے اس صورت میں مشتق ہو گا اجبتہ' اجابۃ و جوابا دوم یہ کہ اجابت کے معنے ہیں سائل کو اس کا مطلوب دینا لفظ مستجاب الدعوات انہیں معنی سے ماخوذ ہے اور آیت اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ الخ میں بھی یہی معنے ملحوظ ہیں چنانچہ اضطرار اس معنے کی تعیین کے لئے کافی ہے اور انہیں معنی کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہے ان اللہ یستحی ان یرد د عبدہ صفراء یعنی اللہ تعالیٰ کو شرم آتی ہے کہ وہ اپنے بندہ کے ہاتھ کو خالی رد کرے۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ مجیب میں صرف قبول دعا کا ہی مفہوم نہیں بلکہ مجیب وہ ذات ہے جو قبل سوال عطاء نعمت کرے یہ امر بجز ذات باری کے کسی اور سے متصور نہیں کیونکہ قبل سوال حاجت مندوں کی حاجت کا علم اسی کو ہو سکتا ہے بلکہ اس کو ازل ہی سے یہ علم حاصل ہے اس لئے اس نے مخلوقات کی حاجت روائی کے لئے اسباب ضروریہ اور ان کے طریق استعمال کو پیدا کر دیا

ہے۔

انسان کامل کو یہ حظ ہونا چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے کام کی اجابت کرے پھر بندگان خدا کے حاجات کو بقدر طاقت رفع کرے اور اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو لطف کلام کے ساتھ انہیں رخصت کر دے۔ قال اللہ تعالیٰ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ اجابت دعوت (ضیافت) بھی اسم مجیب کے حظ میں داخل ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا لودعیت الی کراع لا جبت ولواھدی الی ذراع لقبلت یعنی اگر میں ایک پائچہ گوسپند کی (ضیافت) پر مدعو کیا جاؤں تو میں داعی کی دعوت کی اجابت کرونگا اور اگر میری طرف ذراع (گوشت بازو) ہدیہ بھیجا جاوے تو میں قبول کر لوں گا یہ فرمان حضور علیہ السلام کی اعلیٰ اخلاقی حالت پر دال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو ہرگز یہ منظور نہیں تھا کہ کوئی آپ سے نا امید یا رنجیدہ خاطر رہے برخلاف اس کے اکثر متکبرین اہل دنیا کا شیوہ ہے کہ غرباء کی دعوت پر حاضر نہیں ہوتے بلکہ ایسے مواقع پر شامل ہونے کو اپنی ہتک خیال کرتے ہیں ایسے لوگوں کو اسم مجیب سے کچھ بہرہ نہیں ہوتا۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اپنی طاعت کی طرف دعوت کی ہے اگر بندہ اجابت کرے تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کی دعا جو بندہ کرتا ہے اجابت فرماتا ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مجیب وہ ذات ہے جو دعائے مضطرین کی اجابت فرمائے اور سائلین کی امیدوں کو ناکام نہ رکھے۔

خاصیت

دعا کے ساتھ اس کو ذکر کرنا موجب قبولیت دعا ہے۔

الْوَاسِعُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اور پھر فرمایا وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ یہ اسم مصدر سعۃ بفتح سین و بکسر سین سے مشتق ہے جس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں واضح ہو کہ واسع مطلق صرف ذات باری ہے کیونکہ اسی کی ذات تمام زمانوں میں بلکہ زمانہ کے وجود سے پہلے ازلاً اور ابداً موجود ہے نیز اس کا علم تمام معلومات پر حاوی ہے اور ایک چیز کا علم اس کو کسی دوسری چیز کے علم سے روک نہیں سکتا اسی طرح اس کی قدرت تمام مقدورات ممکنہ پر مشتمل ہے علیٰ ہذا القیاس اس کی سمع و بصر وغیرہ اور یہی حال اس کی رحمت اور احسان کا ہے کہ تمام ذرات کائنات کو شامل ہیں۔

اسم وسیع کا اسم مجیب کے بعد بیان کرنا اس نکتہ پر مبنی ہے کہ وہ ہر ایک محتاج کی اجابت دعا کو ایک ہی آن میں پورا کر سکتا ہے کیونکہ ایک کی اجابت دوسرے کی اجابت سے اس کو روک نہیں سکتی برخلاف انسان کے کہ اس کے صفات محدود ہیں اس لئے وہ ایک ہی آن میں مختلف امور کو سر انجام نہیں دے سکتا یہ امر بالکل نفس الامر ہے۔ بلکہ مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ بعض

افراد انسانی ایسے محدود القوے ہوتے ہیں کہ وہ ایک ہی علم کے سیکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بعض کئی ایک علوم میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شخص امام رازی لکھتے ہیں کہ میرے پاس معتبر اشخاص نے بیان کیا (فاضل شعراء میں سے ایک شخص کی یہ حالت تھی کہ اسے اگر پانچ مختلف الوزن والقافیہ شعر طرح کے طور پر پیش کئے جاتے تو وہ ایک طرف شطرنج بازی میں لگا ہوتا اور دوسری طرف ہر ایک شعر کا جواب سائل کو دے دیتا تھا) ایک آن میں کئی ایک امور کو سر انجام دے سکتا ہے اور اگر اسی وصف کو ذات باری کی نسبت بدرجہ کمال ملحوظ رکھا جائے تو یہ بلاشک قابل تسلیم ہو گا کہ وہ ایک ہی آن میں تمام کائنات عالم کا مدبر و منتظم ہے چونکہ ذات باری کے صفات غیر متناہی ہیں جن کے بیان میں سمندر اگر سیاہی بن جائیں اور درخت قلمیں تو پھر بھی ان کی غایت نامعلوم رہے گی اس لئے وہ ذات فی الحقیقت وسیع کہلانے کی مستحق ہے یعنی ماسوی اللہ جس قدر اشیاء کسی وصف میں وسیع ہوں گی ان میں باہم اضافی طور پر وسعت ہو گی اور اس لئے وہ محدود الوسعت ہیں مگر ذات باری کا علم قدرت سمع بصر رحمت وغیرہ صفات کی کوئی حد یا غایت نہیں اور جب بے حد و غایت ہیں تو ان پر زیادتی ناممکن ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ علم و اخلاق میں وسعت حاصل کرے جس قدر اس کے علم و اخلاق میں وسعت ہو گی اسی قدر اس اسم کا مظہر بننے کا مستحق ہو گا۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کی برہان کے لئے کوئی غایت اور اس کے سلطان کی کوئی نہایت نہ ہو بعض فرماتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس سے قلوب کے خواطر کا اثر مخفی نہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کی غنا کی کوئی حد نہ ہو اور جس کے عطایا لامتناہی ہوں بعض لکھتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کا احسان شامل اور عطا کامل ہو۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے غناء ظاہری اور باطنی حاصل ہو اور فراخ حوصلگی، بردباری پیدا ہو۔

اَلْحَکِیْمُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ قبل ازیں اس حکم کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ لفظ مصدر حکمت سے مشتق ہے اور حکیم کے معنی ہیں صاحب حکمت اس لئے اس اسم کی توجیہ تین طرح پر ہو سکتی ہے اول یہ کہ فعیل بمعنی مفعل یعنی حکیم بمعنی محکم ہے۔

یعنی وہ ذات جس نے اشیاء کو نہایت استحکام اور حسن تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اس توجیہ کی رو سے مکھی مچھر وغیرہ اگرچہ زمین وآسمان کی نسبت کوئی استحکام نہیں رکھتے مگر حسن تدبیر اور حسن صفت کی رو سے وہ قدرت ذات باری پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں جس طرح زمین وآسمان چنانچہ آیت اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ اور آیت خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا میں اسی حسن تدبیر وصفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دوم حکمت سے مراد ہے افضل المعلومات کی بذریعہ افضل العلوم کی معرفت حاصل کرنا اس صورت میں حکیم بمعنی علیم ہوگا امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ افضل العلوم تو ذات باری ہے اور افضل العلم ازلی جس میں کسی

قسم کے نقص یا شک و وسوسہ کو دخل نہیں چونکہ کنہ ذاتِ باری کا علم بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں اس لئے وہی ذات حکیم مطلق بھی ہے۔

سوم حکمت سے مراد ہے ذات باری کا ہر ایک امر ناشائستہ سے بری ہونا۔

قال اللّٰہ تعالیٰ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا

واضح ہو کہ جو شخص جمیع اشیاء کا علم رکھتا ہو مگر ذات باری کی معرفت سے بے بہرہ ہو اسے حکیم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ افضل العلوم سے بے خبر ہوتا ہے اور حکمت اجل العلوم ہے اور کسی علم کا شرف بمقدار شرف معلوم کے ہوتا ہے چونکہ حکمت کا معلوم معرفت ذات باری ہے اس لئے وہ اجل العلوم ہے سو عارف ذات باری ہی در حقیقت حکیم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اگرچہ وہ فصاحت و بلاغت اور دیگر علوم رسمیہ میں بڑا ماہر نہ ہو اسی حکمت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے وَمَن يُّؤْتِيَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا یعنی جس شخص کو حکمت دی جاتی ہے وہ خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نور معرفت سے اس کا قلب حقائق اشیاء کو کما ینبغی مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا کلام کلیات حقائق پر مشتمل ہو جاتا ہے نہ جزئیات پر مثلاً حضور علیہ السلام کے کلمات ذیل پر غور کرو۔ جو سراسر حکمت کا نچوڑ ہیں۔

(ا) راس الحكمة مخافة الله یعنی حکمت کا جزو اعظم خدا کا خوف ہے۔

(ب) الكيس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسه هواها وتمنى على الله الا مانى یعنی دانا وہ شخص ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور آخرت کے لئے عمل کرتا ہو اور عاجز وہ شخص ہے جو ہوائے نفس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے حسن آخرت کی آرزو رکھتا ہے۔

(ج) ماقل وكفى خير مماكثر والهى یعنی قلیل چیز جو کافی ہو کثیر سے جو اللہ تعالیٰ یا آخرت سے روک دے بہتر ہے۔

(د) من اصبح معافاً فى بدنه امناً فى سربه عنده قوت يومه فكانما

حيزت له الدنيا بحذافيرها یعنی جو شخص تندرست ہو اور اپنے جھونپڑے میں آرام سے بیٹھا ہو اور موجودہ دن کی روزی رکھتا ہو یوں سمجھو کہ اس کو ساری دنیا مل گئی۔

(ہ) كن ورعاً تكن اعبد الناس وكن قنعاً تكن اشكر الناس یعنی پرہیز گار ہو تم سب سے بڑھ کر عبادت گذار ہو جاؤ گے اور قانع ہو تم سب سے بڑھ کر شکر گذار ہو جاؤ گے۔

(و) البلاء موكل بالمنطق یعنی بلا آدمی کے کلام سے وابستہ ہے۔

(ز) من حسن اسلام المرء ترك مالا يعنيه یعنی انسان کی خوبی اسلام فضول چیز کو ترک کرنے میں ہے۔

(ح) السعيد من وعظ بغيره یعنی سعادت مند وہ شخص ہے جو دوسرے کی حالت کا مشاہدہ کر کے نصیحت قبول کر لیتا ہے۔

(ط) الصمت حكمة وقليل فاعله یعنی خاموشی حکمت ہے اور اس کے اختیار کرنے والے کم ہیں۔

(ی) القناعة مال لا ينفد یعنی قناعت ایسا مال ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

(ک) الصبر نصف الايمان واليقين الايمان كله یعنی صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے۔

یہ اور اس قسم کے کلمات حکمت کہلاتے ہیں اور ان کے بولنے والے کو حکیم کہتے ہیں۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ حکماء نے حکمت کو علم کا مترادف قرار دیا ہے مگر خاکسار کا خیال ہے اور بعض محققین نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ علم اور حکمت ہر دو متحد المفہوم نہیں چنانچہ آیت اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ میں اگر حکمت اور علم ہر دو کو متحد المفہوم قرار دیں تو لفظ حکیم تاکید سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں دے گا مگر علماء عربیت تاسیس (تاکید میں صرف تکرار لفظ ہوتا ہے اور اس تکرار سے کلام موکد ہو جاتا ہے مگر تاسیس میں زیادت معنی ملحوظ ہوتی ہے

یعنی دوسرے لفظ میں پہلے کی نسبت کوئی زیادہ بات مد نظر ہوتی ہے) کو تاکید سے اولے قرار دیتے ہیں اس لئے لفظ حکیم لفظ علیم سے کسی زائد معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمت کمال قوت علمی اور کمال قوت عملی ہر دو کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ انسان انہیں ہر دو قوت سے درجہ کمال کا مستحق ہوتا ہے اگر کسی شخص میں کمال علم ہو اور پیرایہ عمل سے عاری ہو تو اسے صاحب کمال نہیں کہہ سکتے چنانچہ علم الٰہیات کے علماء نے بھی انہیں ہر دو قوت کے کمال پر حصول حکمت کو موقوف رکھا ہے اور وہ تقسیم حکمت میں ہر دو اقسام علوم یعنی نظری (علمی) اور عملی کو شمار کیا کرتے ہیں اور قرآن مجید نے بھی مردو قوت علمی و عملی کے کمال میں درجات عالیہ اخرویہ کو محدود کیا ہے چنانچہ الفاظ امنوا (کمال علم) وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (کمال عمل) انہیں ہر دو قوت کے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اگر کمال علم و عمل مفہوم حکمت میں ملحوظ نہ ہوتا تو حکمت کو خیر کثیر کے لفظ سے نہ تعبیر کیا جاتا اور نہ انبیاء علیہم السلام کے لئے مقام مدح و فضیلت میں اس کو لایا جاتا دیکھو داؤد علیہ السلام کی نسبت یوں وارد ہوا ہے۔ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ حکیم وہ ذات ہے جو ہر ایک امر کا صحیح اندازہ باندھے اور تدبیر امور میں عین صواب پر چلے بعض لکھتے ہیں کہ حکیم وہ ذات ہے جو اغراض سے بری ہو اور اس کے فعل پر گنجائش اعتراض نہ ہو۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے مصائب دفع ہوں اور دروازہ علم و حکمت کشادہ ہو۔

دعاء

لا اله الا اللّٰه الحليم الحكيم لا اله الا الله رب العرش العظيم لا اله الا الله رب السموات والارض ورب العرش الكريم۔ (ترمذی)

اَلْوَدُوْدُ

جل جلالہ

قال اللّٰه تعالی وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ لغت میں ود کے معنی محبت اور دوستی کے ہیں اس اسم کی توجیہ تین طرح پر ہو سکتی ہے اول یہ کہ فعول بمعنی فاعل لیا جائے یعنی ودود بمعنی واد ہو اس صورت میں اس کے معنی محبّ کے ہوں گے قال اللّٰه تعالیٰ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ مگر اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ انہیں ہر ایک قسم کی خیرات پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے اس توجیہ کی رو سے ود اور رحمت قریب المفہوم ہو جائیں گے کیونکہ رحمت الٰہی کے معنی بھی ارادہ ایصال خیر کے ہیں ہاں ان ہر دو میں ایک لطیف فرق یہی ہے اور وہ یہ ہے کہ رحمت اس امر کی مستدعی ہے کہ اس کا مورد یعنی مرحوم کوئی محتاج ضعیف ہو مگر ود میں یہ امر ملحوظ نہیں بلکہ ود ابتداء انعام و احسان کی مقتضی ہے دوم یہ کہ ودود وہ ذات ہے جو متقین کو خلقت کے نزدیک محبوب بنا دے چنانچہ فرمایا سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا سوم یہ کہ ودود بمعنے مودود ہو جیسے رکوب بمعنے مرکوب مفہوم یہ ہوا کہ وہ ذات جو قلوب اولیاء میں محبوب ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ طریق مشروع پر بندگان خدا سے پورا احسان کرتا ہے بلکہ جو اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسروں کے لئے چاہتا ہے اور جب اس سے زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو وصف ایثار سے متصف ہو جاتا ہے اس حالت میں وہ اپنی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بنی نوع کی ضرورتوں کے پورا کرنے میں سعی کرتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ اسی مقام پر ایک عارف کا قول ہے اریدان اکون جسراً علی النار یعبر علی الخلق ولایتاذون بها یعنی میں چاہتا ہوں کہ دوزخ کے اوپر پل بن جاؤں جس پر لوگ گذر جائیں اور تکلیف نہ پائیں اللہ اکبر کس درجہ کا ترحم ہے اس مقام پر عارف کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ رحم مجسم بن جاتا ہے اور کسی شخص کی دشمنی اور کینہ اس کو احسان اور ایثار سے نہیں روک سکتے یہی وجہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے دندان مبارک غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو مخالفین کی بد سلوکی حضور علیہ السلام کی خیر خواہی میں کچھ مزاحم نہ ہو سکی چنانچہ آپ کی زبان حقائق ترجمان پر باگارہ رب العزت میں یہ کلمات جاری ہوئے اللهم اهدقومی فانهم لایعلمون (خدایا میری قوم کو ہدایت عطا فرما کیونکہ یہ لوگ حقیقت الامر سے بے خبر ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو یہ ارشاد فرمایا اردت ان تسبق المقربین فصل من قطعك واعط من حرمك واعف عمن ظلمك یعنی اگر تو یہ چاہتا ہے کہ مقربیب بارگاہ سے آگے بڑھ جائے تو اس شخص سے جو تجھ سے علیحدہ ہوتا ہے مل اور جو تجھے مرحوم رکھتا ہے اسے دے اور جو شخص تجھ پر تعدی کرتا ہے اسے معاف کر دے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شرط محبت یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کی جفا پر مقام وفا میں ثابت قدم رہے چنانچہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت مروی ہے کہ ایک دفعہ چند آدمی مل کر آپ کے پاس حاضر ہوئے شبلی اس وقت بیمارستان میں بیٹھے تھے آپ نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو انہوں نے جواب دیا کہ

ہم آپ کے محبین ہیں آپ نے ڈھیلے اور پتھر اٹھا کر انہیں مارنا شروع کیا وہ لوگ یہ سلوک دیکھ کر بھاگ نکلے آپ نے فرمایا۔ کہ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو میری تکلیف سے کبھی اعراض نہ کرتے۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ودود وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کے نزدیک اپنی معرفت کی وجہ سے اور اہل معصیت کے نزدیک اپنی عفو رحمت کی وجہ سے اور عوام کے نزدیک روزی اور کفایت امور کی وجہ سے محبوب سمجھا جائے اور بعض نے لکھا ہے کہ ودود وہ ذات ہے جو محبت کی وجہ سے اپنے محبّ کو اغیار سے الگ تھلگ کر لے اور رسوم وآثار بشریت کے ملاحظہ سے ہٹا لے۔

خاصیت

اگر کھانے پر ایک ہزار بار پڑھ کر بی بی کے ساتھ کھاوے تو وہ محبت اور فرمانبردار ہو جاوے۔

دعاء

اللهم ذا الحبل الشديد والا مر الرشيد اسالك الامن يوم الوعيد والجنة يوم الخلود مع المقربين الشهود الركع السجود الموفين بالعهود انك رحيم و دودو انك تفعل ماتريد. (ترمذی)

المَجِيدُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيدُ اس اسم کا صرفی وزن فعیل ہے اس لئے مجید اور ماجد میں وہی فرق ہے جو علیم اور عالم میں یعنی وضع فعیل میں بہ نسبت وضع فاعل کے مبالغہ مدنظر ہے مگر مجد کی تعبیر میں دو قول بیان کیا کرتے ہیں اول یہ کہ مجد کے معنے شرف کامل کے ہیں اور یہی معنے ماخوذ ہیں آیت قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدُ میں سو اس معنی کی رو سے مجد و شرافت اور علو و عظمت کی مستحق صرف وہی ذات اقدس ہے اس تعبیر کی رو سے اسم مجید اسم عظیم کا مترادف سمجھنا چاہیے۔

دوم لفظ مجد لغوی معنی کی رو سے وسعت کے مفہوم پر مشتمل ہے چنانچہ رجل ماجد ایسے شخص کو بولتے ہیں جو سخی اور کثیر الاحسان ہو اہل زبان بولتے ہیں مجدت الدابۃ اذا اعلفتہا مل بطنہا یعنی پیٹ بھر کر چارہ کھلایا اور قرآن (کلام الٰہی) کو مجید بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے کیونکہ وہ کثیر الفوائد ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذات باری کو مجید اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ذات اقدس کثیر الاحسان والافضال ہے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جب اسم مجید کو اسماء ذات باری

شمار کیا گیا تو پھر ماجد کو بلحاظ وصف کے مجید سے کم درجہ پر ہے کیوں شمار کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اسم ماجد اسم واجد کے بعد ذکر کیا گیا ہے جس کے معنی غنی کے ہیں اس لئے لفظ ماجد بطور تاکید لایا گیا ہے یعنی وہ ذات غنی ہونے کے ساتھ کثیر الاحسان بھی ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مجید وہ ذات ہے جو بلند عزت اور جمیل الافعال ہو امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم مجید اسماء جلیل وہاب کریم کے مجموع مفہوم پر مشتمل ہے واللہ اعلم بالصواب۔

خاصیت

اگر مبروص ایام بیض میں روزہ رکھے اور ہر روز افطار کے وقت اس کو بکثرت پڑھے ان شاء اللہ تعالیٰ اچھا ہو جاوے۔

الباعث

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ لغت میں بعث کے معنی ہیں کسی چیز کو ابھارنے اور اٹھانے کے یقال بعث الناقۃ علی الیسر یعنی اونٹنی کو سیر پر ابھارا اس اسم کی تشریح میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کو قبروں سے اٹھائے گا قال اللہ تعالیٰ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء اور رسل کو بغرض ہدایت خلقت کی طرف مبعوث فرماتا ہے قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِہٖ رُسُلاً اِلٰی قَوْمِہِمْ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں مختلف ارادوں کو پیدا کر کے انہیں خاص خاص افعال پر لگاتا ہے چہارم کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو عجز کی حالت میں استمداد پر اور گناہ کے بعد توبہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعث سے نشاء آخرت یعنی مابعد الموت کی حالت مراد ہے اور اسم باعث کی حقیقت کا سمجھنا موقوف ہے حقیقت بعث کی معرفت پر اور حقیقت بعث کی معرفت ایک ایسا ادق اور اصعب امر ہے کہ جس کے ادراک سے افہام عاجز ہیں اور اکثر لوگ اس بارے میں محض

توہمات و تخیلات کے تابع ہیں اور زیادہ سے زیادہ وہ اس امر کا تخیل رکھتے کہ موت عدم ہے اور بعث بعد العدم ایک نئی پیدائش کا نام ہے۔ بعینہ پہلی پیدائش کی طرح سو یہ امر کہ موت عدم ہے غلط ہے کیونکہ جناب رسول اکرم صلعم نے فرمایا کہ قبر جہنم کے گڑھوں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغوں سے ایک باغ ہے اور مرے ہوئے لوگ یا تو اہل سعادت ہوتے ہیں جو در حقیقت مردہ نہیں ہوتے قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راستہ میں قتل کئے گئے ہیں انہیں مرے ہوئے مت سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے پاس روزی دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر خوش زندگی کے مالک ہیں یا اہل شقاوت ہوتے ہیں اور یہ لوگ بھی مردہ نہیں ہوتے چنانچہ غزوہ بدر کے موقع پر جب مشرکین کو ہلاک کر کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا تو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین کو یوں خطاب فرمایا انی وجدت ماوعدنی ربی حقاً فہل وجدتم ربکم حقاً یعنی میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا میں نے تو اس کو سچ پالیا ہے تم لوگوں نے بھی اپنے پروردگار کے وعدہ کو سچ پالیا ہے اس پر آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ مردوں کو کیسے خطاب فرماتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا ماانتم باسمع لما اقول منہم لکنہم لایقدرون ان یجیبوا یعنی تم لوگ میری بات کو ان مقتولین سے زیادہ نہیں سن سکتے تم میں اور ان میں فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ جواب کی قدرت نہیں رکھتے

(منکرین سماع موتی نے جوابات اس حدیث کے متعلق دیئے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کی طرف کچھ توجہ کی جائے منکرین کے معتمد علیہ اور بڑے ثقہ شیخ ابن تیمیہ اپنے مجموعہ رسائل میں اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم کتاب الروح میں سماع موتی کے بڑے زور سے قائل ہیں اور حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جواب دیتے ہیں)

اکابر اصحابہ مکاشفہ اور ارباب مشاہدہ اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ انسان دوام حیات کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس پر فنا کا طاری ہونا محال ہے کیونکہ موت صرف عدم تصرف یعنی قویٰ اور اعضاء کے معطل ہو جانے کا نام ہے۔

رہا یہ امر کہ ایجاد ثانی ایجاد اول کی طرح ہو گا سو یہ بھی صحیح نہیں بلکہ ایجاد ثانی کو ایجاد اول سے کوئی مناسبت نہیں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ صرف یہی دو دفعہ کا ایجاد نہیں بلکہ ہستی انسان کے لئے کئی ایک ایجاد ہیں قال اللہ تعالیٰ وَيُنْشِئَكُمْ فِيمَا لَا تَعْلَمُونَ اسی طرح انسان ہستی کے مختلف مراتب پیدائش کو نطفہ علقہ مضغہ کے بیان کرنے کے بعد فرمایا ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا اٰخَرَ اس جملہ میں خلقاً آخر (ایک اور نئی پیدائش) سے مراد انسانی ہستی کی وہ حالت مراد ہے جب مضغہ کے ساتھ روح جیسی شریف و نفیس حقیقت کو تعلق پیدا ہوتا ہے چونکہ یہ حالت ایک نہایت گرامی اور عظیم الشان تھی اس لئے اس کے بیان کرنے کے بعد فرمایا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ اس پیدائش کے بعد ادراکات حسیہ کا پیدا کرنا ایک علیحدہ ہستی ہے پھر قوت ممیزہ کا قریباً سات سال کے بعد پیدا کرنا ایک نئی ہستی ہے پھر قوت عاقلہ کا قریباً پندرہ سال کی عمر کے بعد پیدا کرنا ایک نئی پیدائش ہے علیٰ ہذا القیاس مابعد کی حالتیں بھی علیحدہ علیحدہ نئی پیدائش کہلاتی ہیں یہی معنی ہیں آیت وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا پھر کمال خلقت انسانی کے بعد خاص خاص افراد کے لئے روحانی کمالات ولایت و نبوت کے حاصل ہونے پر ایک نئی پیدائش کا آغاز ہوتا ہے اور اس لئے ان کمالات سے متصف ہونا گویا ایک قسم کا بعث ہے اسی خیال پر انبیاء علیہم السلام کے مامور ہونے کو بعثت کہا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ باعث ہے چنانچہ فرمایا هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الآیۃ اور بعثت رسل اللہ تعالیٰ کا ویسا ہی ایک فعل ہے جیسا بعث بعد الموت مگر جس طرح حصول قوۃ عاقلہ سے پہلے عجائبات عقل کا ادراک کرنا دشوار ہے اسی طرح طور عقل کا پابند ہو کر کمالات ولایت و نبوت

کی حقیقت کا کوئی شخص ادراک نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ جو شخص جس طور میں زندہ ہوتا ہے وہ اس سے اگلے طور کی حقیقت کا انکار کر دیا کرتا ہے چنانچہ مادہ پرست لوگ عموماً عجائبات روح کا انکار کر دیا کرتے ہیں بلکہ بعث بعد الموت کا انکار بھی صرف اسی خیال پر مبنی ہے سو جس طرح ایک طوز ہستی کے ادراکات کسی آئندہ دوسرے طور سے بالکل علیحدہ ہوتے ہیں اور ہر دور میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی اسی طرح ایجاد بعد الموت یعنی ایجاد ثانی کو ایجاد اول سے کوئی مناسبت نہیں ہاں اشتراک رسمی کی رو سے ہر دو ایک ہیں مگر حقیقت ہر دو کی علیحدہ علیحدہ ہے یہ مسئلہ بجائے خود بہت سے دقیق اور عمیق مباحث پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس موقع پر خارج از آہنگ ہے۔

انسان کامل کو اس سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کی صورت تفصیلی یوں ہے کہ جب انسان پہلے پیدا ہوتا ہے تو ہر ایک قسم کے ادراکات سے خالی ہوتا ہے جوں جوں مختلف اطوار میں منقلب ہوتا ہے اس کے ادراکات میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس لئے قبل از حصول علوم روحانی پہلو میں وہ مردہ شمار کیا جاتا ہے اور جوں جوں علوم حقہ کو زیادہ حاصل کرتا ہے حیات طیبہ کا مالک بنتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جہل موت ہے اور علم حیات اور یہ معنی قرآن مجید سے ماخوذ ہیں قال اللہ تعالیٰ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَلِنِعْمَ ماقیل (الناس موتی واهل العلم احیاء)

سو جس طرح بدن بلا روح زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح روح بلا علم مردہ ہے اس لئے جو شخص علوم حقہ کی طرف رجوع کرتا ہے وہ ایک نئی پیدائش میں منقلب ہوتا ہے اور جب دوسروں کو جہالت سے نکال کر معارف و حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے تو گویا مردہ روحوں کو زندہ کرتا ہے اور اس لئے وہ اسم باعث کا مظہر کامل کہلاتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ باعث وہ ذات ہے جو اہل ہمت کی ہمتوں کو امور عالیہ کے اکتساب کی طرف متوجہ کرے اور قلب سے وساوس و

شکوک کو اٹھادے بعض لکھتے ہیں کہ باعث وہ ذات ہے جو اسرار کو ہوس سے اور افعال کو میل کچیل سے پاک کردے یعنی افعال بشر کو آثار بشریت سے صاف بنا دے حضرت جنید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ باطن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہ کر روحانی بن جاؤ اور ظاہر میں خلقت کے ساتھ جسمانی زندگی بسر کرو۔

خاصیت

سوتے وقت سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو سو بار پڑھا کرے تو اس کا قلب علم و حکمت سے منور ہو

الشَّهِيدُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور پھر فرمایا عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اسم شہید شاہد (اسم فاعل) کا مبالغہ ہے جیسے علیم بمعنی عالم اور قدیر بمعنی قادر اور اس کی تفسیر میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہے اور غیب سے مراد ہر ایک مخفی امر ہے اور شہادت سے مراد ہے ہر ایک امر جو ظاہر ہے یہ ظاہر و باطن محض انسانی علم کی رو سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظاہر و باطن میں کوئی امتیاز نہیں جب نسبت علم ذات باری کی طرف عام طور پر کی جاتی ہے تو اسے خبیر کہتے ہیں اور جب امور مخفیہ اور ظاہرہ ہر دو کو ملحوظ رکھ کر کی جاتی ہے تو اسے شہید بولتے ہیں دوم شہید بمعنی حاضر اور مشاہد بھی مستعمل ہے قال اللہ تعالیٰ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ سوم یہ کہ شہید بمعنی گواہ ہے جو اپنے بیان سے امر متنازع فیہ کے متعلق مدعی کی صداقت کا اظہار کرتا ہے چنانچہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں لفظ شہادت اسی معنی میں ماخوذ ہے بعض مفسرین نے آیت مسطورہ بالا میں شہادت سے یہ مراد لی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنی توحید پر دلائل النفس وآفاق کو قائم کر دیا ہے چہارم شہید بمعنی مشہودلہ ہے یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے بندے اس کی توحید کا اقرار اور شہادت کا اظہار کرتے ہیں اس لئے وہ مشہودلہ ہے قال اللہ تعالیٰ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ آدمی بھی شہید کہلا سکتا ہے اور اس سے مراد ایسا شخص لیا کرتے ہیں جو معرکہ میں مشرکین کے ہاتھ سے قتل کیا جائے اس کی وجہ تسمیہ میں چند اقوال ہیں اول یہ کہ ملائکۃ الرحمٰن حاضر ہوتے اور اس کی روح کو منازل قدس میں لے جاتے ہیں اس لئے شہید بمعنی مشہود ہو گا دوم یہ کہ شہید بمعنی شاہد ہے یعنی ایسا شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے لطف اور اس کی رحمت کا مشاہدہ کر لیا ہوتا ہے سوم نظر بن شمیل کہتے ہیں کہ شہید بمعنی حی زندہ ہے کیونکہ زندہ ہی حالات کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور شہید مقتول ہونے کے بعد زندہ رہتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ چہارم یہ کہ شہید بمعنی حاضر ہے یعنی ایسا شخص جو میدان جنگ میں حاضر ہوتا ہے پنجم یہ کہ قیامت کے دن منجملہ ان لوگوں کے ہو گا جو گذشتہ امتوں پر شاہد گذریں گے قال اللہ تعالیٰ لِتَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ اس امر کو بھی خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ذات باری کا شہید ہونا اولیاء کے لئے تو موجب طرب ہے اور اعداء کے لئے باعث خوف موجب طرب ہونے کے لئے اس واقعہ میں غور کرو کہ جب ایک شخص کو کسی حاکم جبار کی طرف سے تازیانہ لگائے جا رہے تھے تو ایک بزرگ نے اسے کہا کہ الم ضرب پر تمہارے جزع نہ کرنے کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ میں اپنے محبوب کی خاطر پٹ رہا ہوں اور وہ میری اس حالت کو دیکھ رہا ہے بس صرف اسی خیال نے الم ضرب کو مجھ پر آسان کر دیا ہے سو جب ایک مخلوق کی نظر محب پر الم ضرب کو آسان کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر بندہ پر طاعت کو کیسے آسان نہ کر دے گی قال اللہ تعالیٰ وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا یعنی اپنے پروردگار کے حکم پر جمے رہو کیونکہ تم ہماری حفاظت (نگرانی) میں ہو ظاہر ہے کہ اس جملہ میں حضور

علیہ السلام کو ایک اعلیٰ درجہ کی تسلی دی گئی اور یہی تسلی اذیت کفار کو حضور علیہ السلام پر آسان کر دیا کرتی تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے اعداء (مشرکین و کفار) کے حق میں موجب خوف ہونے کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ شرک و معصیت موجب سوء ادب ہیں اور سوء ادب بندہ کو مستوجب عذاب بنا دیتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شہید وہ ذات ہے جو اسرار محبین کی حفاظت کرے اور ہر ایک حال میں ان سے قریب ہو بعض لکھتے ہیں کہ یہ وہ ذات ہے جو قلوب کو اپنے مشاہدہ سے منور فرمائے اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ شہید وہ ذات ہے جو دنیا اور آخرت میں اپنے بندہ کے باطن اور اس کی مناجات سے آگاہ ہو اور بعض نے یوں تعبیر کی ہے کہ شہید وہ ذات ہے جو اپنے محب کے حق میں بہترین جلیس ہو اور اس کے ہوتے ہوئے کسی انیس وہمدم کی ضرورت نہ ہو۔

انیس خلوت شب زندہ داراں
رفیق روز در محنت گذاراں

خاصیت

اگر نافرمان اولاد یا بی بی کی پیشانی پکڑ کر اس کو پڑھے یا ہزار بار پڑھ کر دم کرے وہ فرمانبردار ہو جاویں۔

اَلْحَقُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ اور پھر فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَاتَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ الْبَاطِلُ لفظ حق مشتق ہے حق یحق اذاثبت سے یہی وجہ ہے کہ حق امر موجود کو بولتے ہیں اور باطل امر معدوم کو چونکہ اشیاء اپنے اضداد سے ظاہر ہوتی ہے اس لئے ہر ایک شے جس کی بابت کسی قسم کی خبر دی جاتی ہے یا تو حق مطلق ہو گی یا باطل مطلق یا من وجہ حق ہو گی اور من وجہ باطل سو حق مطلق تو واجب بذاتہ کو کہتے ہیں اور باطل مطلق ممتنع بذاتہ کو اور من وجہ حق اور من وجہ باطل ممکن بذاتہ کو بولتے ہیں ممکن بذاتہ اپنے وجود میں کسی موجد کا محتاج ہوتا ہے چونکہ تمام موجودات بجز ذات باری کے موجد کی محتاج ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ایجاد موجد پر وجود پذیر ہو ورنہ حیز عدم سے نکل کر کبھی دائرہ وجود میں نہیں آسکتی چنانچہ آیت كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ میں اسی حقیقت امکانیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی خیال پر اہل حقیقت بولا کرتے ہیں لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ واجب الوجود حقیقی بجز ذات باری کے کوئی موجود

نہیں وہی ازل سے ابد تک موجود ہے اس لئے جب کوئی چیز وجود پذیر ہوتی ہے تو اسی ذات مقدس کے ایجاد سے موجود ہوتی ہے سو وہی ذات حق مطلق ہے جو اور اشیاء کو حق بناتی ہے قال اللہ تعالیٰ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ چونکہ ذات باری حق ہے اس لئے جس طرح اس کا وجود ازلی وابدی ہے اسی طرح اس کے وجود کا اعتقاد اور اس کے صفات کاملہ کا اقرار بھی حق ہے جو ازلا وابدا قائم اور بے زوال ہے۔ کیونکہ جب اس ذات مطلق کو فنا نہیں تو اس کے صفات کاملہ اور اس کے اعتقاد و اقرار پر بھی زوال کا عائد ہونا ناممکن ہے پس وہی ذات حق ہے اور اسی کی معرفت (اعتقاد) احق المعارف ہے اور اسی کے صفات کاملہ کا قائل ہونا (اقرار) احق الاقول ہے اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ کلمہ طیبہ جس کی وصف ان الفاظ میں کی گئی ہے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کیونکہ اسی سے اس ذات مطلق کے موجود حقیقی ہونے اور اس کے صفات کاملہ کے اعتقاد اور اقرار کی ضرورت کا علم حاصل ہوتا ہے۔

تنبیہ

کتب سیر میں لکھا ہے کہ حسین بن منصور حلاج نے انا الحق پکارا تھا جس پر علمائے وقت نے اسے واجب القتل قرار دیا چونکہ اس امر کے فہم حقیقت میں بسا اوقات لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے لہذا مختصرا اس کے متعلق بحث کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر خوبی یاد رکھنا چاہیے کہ واجب کبھی ممکن نہیں ہو سکتا اور نہ ممکن کبھی واجب ہو سکتا ہے اس لئے عبد عاجز خواہ کسی مقام عرفان تک ترقی کر جائے پھر بھی عبد ہی رہتا ہے اور یہ کہنا کہ عبد فانی ہو کر اپنی حقیقت امکانیہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور واجب بالذات کا مقام حاصل کر لیتا ہے جس کو اصطلاح میں اتحاد کہتے ہیں کفر صریح ہے کیونکہ اگر ہر دو شے باوجود اتحاد کے باقی رہیں تو اتحاد ثابت نہ ہو گا اور اگر ہر دو فانی ہو جائیں تو ایک تیسری شے موجود ہو گی اور

اگر ایک باقی ہے اور دوسری فانی ہو جاوے تو اتحاد ناممکن ہے کیونکہ کوئی موجود عین معدوم نہیں ہو سکتا سو جب تینوں صورتیں باطل ہیں تو اب دیکھنا ہے کہ کوئی صحیح تاویل جملہ انا الحق کی ممکن ہو سکتی ہے یا نہیں اہل معرفت نے اس کی مختلف تاویلات کی ہیں مگر قوی تاویل یہ ہے کہ قائل کو مقام فنا کلی حاصل ہو چکا تھا جہاں اپنے نفس کا شعور اور اس عدم شعور کا شعور بھی نہیں ہوتا یعنی انوار جلال کا اسقدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ عارف کو استغراق کلی اور محویت مطلق کی حالت میں بجز ذات واحد حقیقی کے کسی غیر کا مشاہدہ نہیں ہوتا اور اس لئے ذات احدیت کی طرف ایسے کلمات عارف کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں گویا ذات باری ہی اپنے تئیں انا الحق کہہ کر پکارتی ہے نہ یہ کہ وہ عبد ضمیر انا سے اپنی ذات مراد لیتا ہے کیونکہ اسے تو اپنی ذات کا شعور ہی نہیں ہوتا اور ایسی بے شعوری میں وہ اس قسم کے کلمات زبان پر لاتا ہے کما قیل انا من اھوی ومن اھوی انا

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو باطل خیال کرتا ہے اور سوذات باری کے کسی موجود کو حق نہیں جانتا چونکہ حق مطلق وہی ذات مقدس ہے اس لئے اس کی معرفت اور عقائد صحیحہ بھی جو شریعت میں وارد ہو چکے ہیں حق ہیں۔

اہل تصوف عموماً اسم حق کا استعمال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص مقام مکاشفہ میں ہوتا ہے اسے ماسوی اللہ سب باطل نظر آتے ہیں برخلاف اس کے متکلمین اسم باری کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ مقام استدلال میں ہوتے ہیں یعنی مخلوق سے خالق کے اثبات پر استدلال کرتے ہیں۔

خاصیت

ایک مربع کاغذ کے چاروں گوشوں میں لکھ کر اس کو ہتھیلی پر رکھ کر آخر شب میں آسمان کی طرف بلند کرے تو مہمات کو کفایت ہو۔

الوکیل

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا اور پھر فرمایا لَا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا یہ اسم مصدر وکالت سے مشتق ہے یقال وکل الیہ الامر وکلاً وکولاً کاربدو گذاشت و سپرد بروئے ووکل باللہ وکلا تکیہ نمود برخداو اعتراف کرو بجز خود وکیل وزن صرفی میں فعیل ہے جو بمعنی مفعول یعنی موکول مستعمل ہے اور مراد اس سے موکول الیہ ہے یعنی وہ ذات جس پر بندے اپنے مصالح امور کو سپرد کر کے اعتماد کرتے ہیں اور وہ ان کے امور کی متکفل ہو جاتی ہے اس تعبیر کی توجیہ یہ ہے کہ مصالح امور کو کسی غیر کی تحویل و تفویض میں دنیا دو شرطوں سے مشروط ہے اول یہ کہ موکل خود اس امر کو سر انجام دینے سے عاجز ہو اور مخلوق کا اپنے مصالح امور کی سر انجام دہی سے عاجز ہونا ظاہر ہے دوم موکول الیہ (وکیل) کمال علم اور کمال قدرت اور کمال رحمت اور کمال استغناء سے موصوف ہو کیونکہ ان صفات کے عدم کی صورت میں وکیل سر انجام دہی سے عاجز ہو گا یا خود غرض یعنی جہل بجز عدم شفقت و احتیاج ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے موکول الیہ ہرگز وکالت کے قابل نہیں ہو سکتا اور

جب یہ چاروں صفات بروجہ کمال اسے حاصل ہوں تو مصالح امور کی تفویض کے لئے وہ موزوں ہو سکتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو یہ صفات بروجہ کمال حاصل نہیں اس لئے وکیل ہونا بھی اسی ذات اقدس کا منصب ہے چنانچہ آیت وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَحَسْبُهٗ میں ان ہی صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چونکہ کوئی مخلوق ان صفات کا اہل نہیں ہو سکتا اس لئے اسباب ظاہری کی پابندی کرنا بطور عادۃ اللہ کے منافی توکل نہیں ہاں اسباب کو موثر جاننا عین شرک ہے جو لوگ حقیقت توحید سے آگاہ ہیں وہ اسباب کو نظر انداز کر کے سبب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مشیت ازلی کو بلاواسطہ موثر دیکھتے ہیں جس قدر کوئی شخص اس حقیقت سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے اسی قدر حوادث خیر و شر سے کم متاثر ہوتا ہے الغرض حقیقت توکل پر مطلع ہونا سخت دشوار امر ہے اہل تعلق کو یہ پایہ نصیب نہیں بلکہ ان کے پاس مقام توکل کا ذکر کرنا انہیں حقیقت توحید سے نفرت دلاتا ہے آیت رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا کے معنی میں غور کرو کہ کس طرح اس ذات اقدس نے الفاظ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ سے اپنا متصرف کل ہونا ظاہر فرما کر جملہ لا الہ الاھو سے اپنی توحید کا پتہ دیا ہے اور پھر حرف فاء سے جو معنی تفریع پر متضمن ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ جب موثر حقیقی وہ ذات بے ہمتا ہے تو بجز اس کے کسی غیر کی طرف مصالح امور میں رجوع کرنا منافی توحید ہے اسی کو ہر حال میں اپنا متکفل اور نگران حال سمجھو مگر یہ مقام بجز عارف کامل کے جو رسوم اہل ظاہر سے آزاد ہو چکا ہے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ اس حقیقت کے عسر الفہم ہونے کی طرف حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدوا خماصاً و تروح بطاناً یعنی اگر تمہیں حقیقت توکل کا کماحقہ پایہ نصیب ہوتا تو تمہیں اسی طرح روزی دی جاتی جس طرح پرندوں کو دی جاتی ہے جو صبح سویرے اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام پیٹ بھرے واپس آتے ہیں یعنی وہ تمہاری طرح نہ تو ہل

جوتتے ہیں نہ محنت کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہیں ہر روز کا قوت پہنچا دیتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ وکیل وہ ذات ہے جو پہلے اپنے بندہ کو رجوع الی الغیر سے کافی ہو کر اس کے لئے نگران حال ہو اور بالآخر اسے اپنی ولایت کے مقام تک ترقی دے۔

خاصیت

ہر حاجت کے لئے اس کی کثرت مفید ہے۔

دعاء

حسبی اللہ ونعم الوکیل (حصن حصین)

اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید انک الرب وحدک لا شریک لک اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید ان محمد اصلی اللہ علیہ وسلم عبدک و رسولک اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ اللھم ربنا ورب کل شئی اجعلنی مخلصاً لک واھلی فی کل ساعۃ فی الدنیا والا خرہ ذا الجلال والا کرام اسمع واستجب اللہ الا کبرا لا کبر حسبی اللہ ونعم الوکیل اللہ اکبر الاکبر۔ (حصن حصین)

اَلْقَوِیُّ اَلْمَتِیْنُ

جل جلالہ　　　جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ یہ ہر دو اسم علیحدہ علیحدہ قوت اور متانت سے مشتق ہیں قوت سے تو قدرت کاملہ مراد ہے اور متانت سے شدت قوت چونکہ قوت کسی چیز کی اس کمال کا نام ہے جس سے وہ دیگر اشیاء میں موثر ہو اور خود وہ کسی دوسری چیز سے اثر پذیر نہ ہو اس لئے ذات باری کے قوی ہونے کی توجیہ یوں ہو گی کہ قوی وہ ذات واجب الوجود ہے جو ممکنات میں حسب ارادہ موثر ہے کیونکہ وہی ایجاد اور تغیر و انقلاب کا مالک ہے اور خود کسی چیز سے کسی قسم کا اثر قبول نہیں کر سکتا اسی طرح اسم متین کی توجیہ ہو سکتی ہے کیونکہ متانت کے معنی صلابت کے ہیں اور صلابت کسی چیز کی شدت کو بولتے ہیں متن بمعنیٰ پشت اسی سے مشتق ہے اور اسی وجہ سے ظہر بمعنی قوت مستعمل ہے قال اللّٰہ تعالیٰ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ویقال کلام متین اذا کان قویاً

لفظ قوت بلوغ القدرۃ کا افادہ کرتا ہے اور متانت شدت قوت اور ہر دو میں اعتباری فرق ہے اور انسان کامل کو ان ہر دو اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے

کہ وہ اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے ماسوی اللہ کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور کم از کم اس کا رتبہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کے مقتضا پر غالب آتا ہے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جو شخص قوت ذات باری کو جان لیتا ہے وہ اپنے عزم سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

خاصیت

القوی

اگر کم ہمت پڑھے باہمت ہو جاوے اگر کمزور پڑھے زور آور ہو اگر مظلوم اپنے ظالم کے مغلوب کرنے کو پڑھے وہ مغلوب ہو جاوے۔

المتین

مثل خواص القوی کے ہے اور اگر کسی فاجر مرد یا عورت پر پڑھا جاوے تو فجور سے باز آوے۔

الوَلِیُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور پھر فرمایا اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اسم مولی بھی بمعنی ولی مستعمل ہوتا ہے چنانچہ مختلف آیات میں اس کا استعمال آچکا ہے۔

واضح ہو کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ اہل ایمان کا ولی ہے اسی طرح اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے اولیاء کہلاتے ہیں چنانچہ فرمایا اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ اور اس اسم کی توجیہ میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ ولی بمعنی متولی ہے اور متولی اس شخص کو بولتے ہیں جو کسی امر کی نگہداشت اور سر انجام دہی کا متکفل ہو چنانچہ ولی الیتیم اس شخص کو بولتے ہیں جو یتیم کے نیک و بد حالات کا نگران اور اس کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ولی المراۃ وہ شخص ہوتا ہے جو عورت کے عقد نکاح کا مجاز اور متکفل ہو دوم یہ کہ ولی بمعنی ناصر و یاور کے ہے چنانچہ اولیاء السلطان ان اشخاص کو بولتے ہیں جو اس کے اعوان و انصار ہوں قال اللہ تعالیٰ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ای انصارکم معنی اول کے رو سے اس اسم کے معنی کافر اور مومن ہر دو کو شامل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام

مخلوقات کے امور کا والی ہے اور معنی ثانی کی رو سے اس کے معنی صرف اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں سوم یہ کہ ولی بمعنی محب ہے چہارم یہ کہ ولی بمعنی موالی ہے جیسے جلیس بمعنی مجالس اور موالات کے معنی باہم دوستی کرنے کے ہیں اہل لغت لکھتے ہیں کہ ولی کے معنی قریب کے ہیں کیونکہ ولی بروزن غنی مشتق ہے ولی یلی سے جس کے معنی قرب کے ہیں اس لئے لفظ ولی کے جو معنی لئے جائیں گے ان میں اپنے ماخذ کے رو سے معنی قریب کا مفہوم ضرور ملحوظ ہو گا چنانچہ ذات باری بندوں سے اس قدر قریب ہے کہ کوئی اور چیز اس سے زیادہ قریب نہیں ہو سکتی اور اس قریب کا ذکر آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ میں محض بطور تفہیم ذکر کیا گیا ہے ورنہ ذات باری کے قرب کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ ولی وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کی نصرت اور اعداء کی ذلت کرے یعنی اس کا ولی منصور اور عدو مقہور رہتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ ولی وہ ذات ہے جو بلا علت اپنے اولیاء سے محبت رکھے اور ارتکاب ذلت پر اپنی بارگاہ سے رد نہ کرے بعض لکھتے ہیں کہ ولی اس ذات کو بولتے ہیں جو سیاست نفوس اور تہذیب قلوب کی والی ہو بعض لکھتے ہیں کہ ولی احسان کا کامل اور وعدہ کے وفا کنندہ کو کہتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندوں میں سے وہ شخص ولی کہلا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء سے محبت رکھتا اور ان کی نصرت کرتا ہو اور اعداء اللہ سے عداوت رکھتا ہو نفس و شیطان بھی منجملہ اعداء اللہ کے ہیں جن سے عداوت اور مخالفت برتا ولی اللہ کا فرض ہے۔

خاصیت

جو بکثرت اس کو پڑھے محبوب ہو جاوے اور جس کو کوئی مشکل پیش آوے شب جمعہ میں ہزار بار پڑھے۔

الحمید

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ حمید یا تو فعیل بمعنی فاعل یعنی حامد ہے کیونکہ وہ ذات اقدس ازل سے خود اپنی حمد کی مالک ہے چنانچہ فرمایا اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ یا فعیل بمعنی مفعول یعنی محمود ہے کیونکہ وہ خود اپنے حمد کا مالک ہے اور اس کے بندے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اس لئے وہ ذات اقدس محمود ہے بعض نے لکھا ہے کہ حمید وہ ذات ہے جو مستحق حمد وثناء ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کے عقائد شبہات سے اور اس کے اعمال شہوات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ حمید وہ ذات ہے جو خیرات کی توفیق عطا فرما کر ان پر حمد کرے اور گناہوں کو محو کر کے ان کی یاد دلانے سے نادم نہ کرے۔

تنبیہ

عوام الناس تو جسمانی لذات کے حصول پر حمد کیا کرتے ہیں اور خواص

انعامات روحانی کے موصول ہونے پر مگر مقربین بارگاہ صرف اس لئے حمد کیا کرتے ہیں کہ حمد کا استحقاق بجز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں سو حمید مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں اور عباد اللہ میں سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سزاوار حمد ہیں کیونکہ آپ کے کمالات و فضائل کا حصر ناممکن ہے پھر دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام اور پھر عامہ اولیاء اللہ رضی اللہ عنہم۔

خاصیت

اس کی کثرت سے اخلاق و افعال و اقوال حمیدہ حاصل ہوں۔

اَلْمُحْصِیُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَحْصٰی کُلَّ شَیْئٍ عَدَداً مصدر احصاء سے مشتق ہے جس کے معنی شمار کرنے اور نگاہ رکھنے کے ہیں احصاء در حقیقت وصف علم ہی کا نام ہے جبکہ معلومات کے شمار اور احاطہ کا مفہوم علم میں ملحوظ رکھا جائے۔

محصی مطلق بجز ذات باری کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی افراد موجودات اور ان کے حرکات و سکنات کا علم رکھتا ہے اور وہی قیامت کے دن بندوں کے اعمال کا حساب لے گا قال اللہ تعالیٰ اَحْصَاہُ اللّٰہُ وَنَسُوْہُ

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے محصی ہونے کا یقین کر لیتا ہے تو وہ اپنے تمام اعمال نفس کی نگہداشت کرتا ہے۔
حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ محصی وہ ذات ہے جو ظاہر پر بینا اور باطن پر آگاہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ وہ ذات جو اپنے بندہ کے اعداد طاعات کی حافظ اور اس کے جمیع حالات سے آگاہ ہو۔

خاصیت

اگر روٹی کے بیس ٹکڑوں پر بیس بار پڑھے تو خلقت مسخر ہو۔

اَلْمُبْدِیُٔ اَلْمُعِیْدُ

جل جلالہ　　جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّہٗ ھُوَ یُبْدِیُٔ وَیُعِیْدُ ابداء کے معنی ہیں از سر نو کسی چیز کا وجود میں لانا اور اعادہ کے معنی کسی چیز کے لوٹانے کے ہیں اصل میں ابداء اور اعادہ ہر دو بمعنیٰ ایجاد کے ہیں فرق یہ ہے کہ ایجاد اگر از سر نو ہو تو اسے ابداء کہتے ہیں اور اگر پہلے کوئی چیز فانی ہو کر پھر وجود میں لائی جاوے تو اسے اعادہ کہیں گے اس تعبیر کے مطابق ان ہر دو اسم کی توجیہ یہ ہو گی کہ وہی ذات اقدس مخلوقات کو از سر نو عدم سے وجود میں لانے والی ہے اور وہی عدم میں لے جا کر پھر ان کو عرصہ محشر میں اکٹھا کرے گی اور اسی اکٹھا کرنے کو اعادہ کہا گیا ہے سو جس طرح اشیاء کا آغاز اسی سے ہے اور ان کا انجام بھی اسی کی طرف ہے۔

خاصیت

المبدی

حاملہ کے بطن پر آخر شب میں پڑھے تو حمل محفوظ رہے اور ساقط نہ ہو۔

المعید

اگر کوئی بات بھول جاوے اور یاد کرنے سے یاد نہ آوے تو اس کو بار بار ذکر کرے خواہ تنہا یا یامبدی کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ یاد آجاوے۔

المُحیِ جل جلالہ المُمِیتُ جل جلالہ

قال اللہ تعالی ھُوَ الَّذِیْ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ واضح ہو کہ حیات اور موت ہر دو کا خالق اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ فرمایا اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ اور موت و حیات کی ان کے موارد کے لحاظ سے مختلف صورتیں ہیں مثلاً وہی ذات باری نطفہ اور علقہ میں حیات کو پیدا کرتی ہے اور وہی ذات اقدس زمین مردہ کو باران رحمت سے حیات بخشتی ہے اور وہی قلوب غفلت زدہ کو اپنے ذکر سے زندہ کرتی ہے اور وہی ارواح سالکین کو انوار تجلیات سے حیات طیبہ عطا فرماتی ہے اور واصلین کو مقام مشاہدہ میں انعام جمال سے عزت بخشتی ہے قال اللہ تعالیٰ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنَاہُ اور پھر فرمایا وَلَا یَسْتَوِی الْاَحْیَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ان آیات میں جسمانی حیات و ممات اور روحانی حیات و ممات ہر دو کا مفہوم داخل ہے۔

حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ محی وہ ذات ہے جو اپنے ذکر سے قلب کو زندہ کرے اور احسان سے مطیع بنائے اور شکر کی توفیق عطا فرماوے اور ممیت وہ ذات ہے جو قلب کو غفلت سے مردہ بناوے اور نور عقل پر ظلمت نفس

کو غالب کر دے۔

خاصیت

الحی

جس کو کسی سے مفارقت کا اندیشہ ہو یا قید کا خوف ہو اس کو بکثرت پڑھے۔

الممیت

جس کو عادت اسراف کی ہو یا نفس طاعت پر آمادہ نہ ہوتا ہو تو اس کی کثرت کرے۔

الحیُّ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ هُوَ الْحَیُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ حیات منبع فعل اوراک کا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں اسم حی کا ذکر اس لئے فرمایا ہے تاکہ اپنا حی لایموت ہونا ظاہر کرے کیونکہ ماسوائے اللہ جو حی ہے وہ مورد موت ہے قال اللہ تعالیٰ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ اس لئے حی کامل بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہی یہی وجہ ہے کہ کوئی موجود اس کے اثر فعل اور اوراک سے خارج نہیں کیونکہ کمال حیات مقتضی کمال فعل و اوراک کا ہے اور ماسوائے اللہ جس قدر احیاء ہیں ان میں کمال حیات کے رو سے مدلرج ہیں چنانچہ ان کے افعال اور وسعت اوراک سے اس امر کا بخوبی پتہ لگتا ہے۔

انسان کامل کو وصف حیات سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کا کمال معیار اس کے افعال و اوراک کی وسعت سمجھنی چاہیے اسی نکتہ پر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ میں شہداء کو احیاء کہا گیا ہے کیونکہ جہاد اللہ تعالیٰ کی محبت پر مبنی ہے اور محبت حیات قلب کا واسطہ ہے۔

تنبیه

قبل ازیں اسماء ذات باری کے توقیفی ہونے کا مسئلہ لکھا جا چکا ہے اسی مسئلہ کی بناء پر ذات باری کو حیوان نہیں بلکہ حی کہیں گے۔

خاصیت

اس کی کثرت یا لکھ کر پینے سے ہر قسم کے امراض سے نجات ہو۔

دعاء

یا حی یا قیوم برحمتك استغيث (حصن حصين)

اَلْقَيُّوْمُ

جل جلاله

قال اللّٰہ تعالیٰ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ممکن اور واجب کے رو سے موجودات کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں یا تو تمام موجودات ممکن ہوں گی اور اس صورت میں ممکن کا بلا علت وجود میں آنا تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ ممکن کسی دوسرے ممکن کے وجود کے لئے علت نہیں ہو سکتا یا تمام موجودات واجب ہوں گی اس صورت میں موجودات کا تعین بھی علیحدہ علیحدہ ہو گا اور یہیں سے ہر ایک کا مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک سے ہر ایک مرکب ہونا لازم آئے گا اور ترکیب منافی وجوب ہے اس لئے تمام موجودات کا واجب ہونا بھی باطل ٹھہرا اب رہی تیسری صورت اور وہ یہ ہے کہ بعض موجود تو واجب ہو اور بعض ممکن اور یہی صورت صحیح بھی ہے یہ ضروری ہے کہ واجب صرف ایک ہی ذات ہو گی متعدد نہیں ہو سکتی کیونکہ واجب کو متعدد مان لینے کی صورت میں مذکورہ بالا قباحت لازم آئے گی یعنی کہ مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک سے ہر دو کا مرکب ہونا جو منافی وجوب ہے اس لئے یقیناً تمام موجودات ممکنہ کا خالق صرف ایک ہی ذات ہو سکتی ہے اور وہ واجب ہی ہو گی اور باقی تمام موجودات ممکن جو بلحاظ مخلوق

ہونے کے ذات واجب کی طرف محتاج ہو گی چونکہ واجب کا ہر ایک جہت سے بے نیاز ہونا ضروری ہے اس لئے وہ ذات قائم بذاتہ ہونے کے علاوہ دیگر موجودات کے لئے سبب قیام بھی ہو گی مطلب یہ کہ جہاں وہ ذات سبب وجود ہے سبب قیام وجود بھی ہے چونکہ اسم حی فاعل مدرک کے مفہوم پر مشتمل ہے اور اسم قیوم قائم بذاتہ اور مقوم لغیرہ کے مفہوم پر متضمن ہے اس لئے یہ ہر دو اسم علم توحید کے بے شمار مسائل ضروریہ کے لئے بمنزلہ اصول کے قرار دیئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ایک موقع پر ان ہر دو کو ملا کر ذکر کیا کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ وصف قیومیت کے لئے چند ایک لوازم ہیں اول یہ کہ ذات واجب الوجود ایک ہی ہو گی نہ متعدد دوم یہ کہ وہ کسی محل میں متحیز نہ ہو سوم یہ کہ اس کو تمام موجودات کا علم بروجہ کمال ہو چہارم تمام موجودات اپنے وجود اور قیام وجود میں اس کی محتاج ہو پنجم تمام امور و حوادث بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی طرف منسوب ہوں ان مذکورہ بالا لوازم میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ تمام مسائل علم الٰہیات کے جن پر علم کلام میں بحث کی جاتی ہے انہیں ہر دو اسم پر مترتب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان اسماء اور ان آیات کی جن میں یہ واقع ہوئے ہیں فضیلت بدرجہ غایت تسلیم کی گئی ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسم اعظم الحی القیوم ہے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے دن سجدہ میں دیر تک صرف یا حی یا قیوم پکارتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت سے اہل ایمان کی عزت افزائی کی۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ ماسوائے اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے ابویزید رحمتہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ توکل کی یہ حقیقت ہے کہ بندہ بجز ذات باری کے کسی کو اپنا ناصر و رازق نہ جانے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہی ذات قائم و قیوم ہے وہ تمام خلقت سے امید قطع کر لیتا ہے۔

خاصیت

اس کی کثرت سے نیند آتی ہے یا حی یا قیوم کو فجر سے طلوع تک پڑھنے سے مستعدی اور آمادگی طاعات میں حاصل ہو۔

دعاء

اللھم غارت النجوم وھدات العیون وانت حی قیوم لاتا خذك سنة ولا نوم یا حی یا قیوم اھدی لیلی وانم عینی۔ (حصن حصین)

استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم وا توب الیه

الوَاجِدُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن اسماء ذات باری میں بالاتفاق شمار کیا گیا ہے لغت عرب کی رو سے اس لفظ کا استعمال تین طرح ہوا کرتا ہے اول واجد بمعنی غنی یقال وجد فلان وجداً وجدۃً یعنی مالدار ہو گیا ایک حدیث میں وارد ہوا ہے لی الواجد ظلم یعنی تونگر آدمی کا ادائے قرضہ میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اگر اس اسم کو مادہ ہذا سے مشتق سمجھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ واجد وہ ذات ہے جو اپنے ارادہ کے نافذ کرنے پر کامل قدرت رکھتی ہو۔

دوم واجد بمعنی عالم یقال وجدت فلاناً فقیہاً یعنی میں نے فلاں شخص کو فقیہ پایا اس صورت میں وجود سے مشتق ہو گا۔

سوم واجد بمعنی حزین مگر اس معنی میں ذات باری پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہاں وجد علیہ بمعنی غضب علیہ مستعمل ہے لہذا ذات باری کے متعلق اس کی توجیہ یہ ہو گی کہ واجد وہ ذات ہے جو کفار و فساق کو مغضوب علیہم بناتی ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ واجد (کسی چیز کا پانے والا) فاقد

(کسی چیز کا کھونے والا) کی ضد ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ وہ ذات جو کسی غیر ضروری چیز کو کھودے اسے فاقد نہیں کہہ سکتے اور نہ جس کے پاس کوئی غیر ضروری چیز موجود ہو اس کو واجد کہہ سکتے ہیں بلکہ واجد ایسی ذات کو کہنا چاہیے کہ جس کو ہر ایک چیز جو اسی کے لئے ضروری ہے حاصل ہو سو ذات باری کے لئے کمال صفات ضروری ہے جو اسے من کل الوجوہ حاصل ہے اسی لئے واجد مطلق فقط ذات باری ہے اور دیگر مخلوق کو اگر واجد کہا جائے گا تو صرف اضافی طور پر نہ حقیقی طور پر۔

خاصیت

لقمہ پر پڑھ کر کھاوے تو تقویت قلب حاصل ہو۔

اَلْمَاجِدُ

جل جلالہ

یہ اسم مجد سے مشتق ہے اور ماجد اور مجید میں وہی فرق ہے جو عالم اور علیم میں ہے گذشتہ صفحات میں اس کی تشریح ہو چکی ہے۔

خاصیت

جو دواماً پڑھے قلب منور ہو۔

اَلْوَاحِدُ الْاَحَدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالی وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ اور پھر فرمایا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ہر دو اسم ذات باری کی وحدت کا مفہوم ظاہر کرتے ہیں اور ان ہر دو میں امتیاز کرنا چاہیے ضروری ہے کہ پہلے بطور تمہید کے حقیقت ذات کے ناممکن الادراک ہونے پر بحث کی جائے۔

واضح ہو کہ وحدت حقیقی ذات باری کا علم ناممکن ہے کیونکہ انسان واحد کو وحدت اضافی یا وحدت عددی کی صورت میں تصور کر سکتا ہے مگر ذات باری کی وحدت ان ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ وحدت اضافی کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز باوجود کثرت پر مشتمل ہونے کے دوسری اشیاء کی نسبت واحد کہلا سکتی ہے مثلاً ایک چیز چند اشیاء کے مجموعہ کو ظاہر کرتی ہے مگر وہ بجائے خود واحد ہے مگر اس کی وحدت حقیقی نہیں کیونکہ وہ کئی اکائیوں کا مجموعہ ہے اور وحدت عددی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شے سلسلہ شمار میں اگر بہ نسبت دیگر اشیاء معدودہ کے واحد کہلاتی ہے مثلاً ہم کسی چیز کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ ویسے دوسری چیز کا وجود ممکن ہے اس طرح ہم ایک نوع کے دو فرد کو دو بولتے ہیں اس لئے کہ ویسے تیسرے فرد کا وجود ممکن ہے۔ علی ہذا القیاس جس عدد کا درجہ ہم کسی

فرد کے لئے تجویز کریں گے اس کے ساتھ اس کے مثل کا وجود ممکن ہوگا گو خارج میں اس کا مثل موجود ہونا محال نہیں ہو سکتا مثلاً مثل آفتاب خارج میں موجود نہیں مگر اس کا موجود ہونا محال نہیں بلکہ ممکن ہے اس لئے ذات باری کا واحد ہونا نہ تو بطور وحدت اضافی کے ہے اور نہ بطور وحدت عددی کے بلکہ اس کا واحد ہونا حقیقی ہے جس میں نہ تو کثرت کو دخل ہے اور نہ اس کا مثل ممکن ہے بلکہ اس کی وحدت کا اقتضا یہ ہے کہ اگر اس کا انکشاف ہو تو تمام موجودات عالم نیست و نابود ہو جاوے کیونکہ وجود حقیقی کے سامنے کسی دوسرے موجود کا ثابت الوجود ہونا ناممکن ہے اسی امر کی طرف ایک حدیث میں یوں اشارہ کیا گیا ہے لاحرقت سبحات وجهه من انتهى اليه بصره من خلقه یعنی اگر وہ ذات مظاہر کائنات پر جلوہ افروز ہو تو اس کے انوار تمام موجودات کو جلا دیں اور کوئی غیر اللہ معرض وجود میں نہ رہے ولنعم ما قال الشیرازی

چو سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن مجید میں پڑھو حالانکہ اپنی تجلی صفات کا مقام تھا نہ تجلی ذات کا قال اللّٰہ تعالیٰ فلما تجلى ربه للجبل جعله دكا وخر موسى صعقا اسی امر کی طرف اشارہ ہے آیت لو انزلنا هذا القرآن على جبل الآية انسان جو کچھ ذات باری کے متعلق تصور کرتا اور تجویز کرتا ہے ذات باری اس سے بالاتر ہے کیونکہ انسان ایک مخلوق عاجز ہے اور مخلوق اپنے خالق کی حقیقت کا کیونکر ادراک کر سکتی ہے۔

ہاں ہر ایک شخص اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق کچھ نہ کچھ سمجھتا ہے مگر ذات باری اس سے پاک اور بری ہے۔

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاران دیگرے رامے پرستند

الغرض ذات باری کی کنہ یا حقیقت کا ادراک محال ہے اور عاجز انسان کو

بجز تسلیم ضعف و عجز کے کوئی چارہ نہیں۔

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

باد بدست سے مراد ناکامی ہے۔

جنید سید الطائفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت توحید کے بارے میں جو بہترین کلمات کہے گئے ہیں ان میں جناب صدیق اکبر نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں اصوب و اشرف ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں سبحان من لم يجعل لخلقه سبيلا الى معرفته الا بالعجز عن معرفته یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی مخلوق عاجز کے لئے اپنی طرف آنے کا بجز اقرار عجز کے کوئی راستہ نہیں مقرر کیا اسی خیال کو آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا ہے العجز من درك الا دراك ادراك

اکابر حضرات ائمہ طریقت نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ مقام توحید کی حقیقت کو الفاظ میں لانا ناممکن ہے کیونکہ جب کوئی شخص اس مقام کے متعلق کچھ کہے گا تو ضروری ہے کہ مخبر عنہ اور مخبر بہ اور مخبر تین امور وہاں موجود ہوں اور یہ امر منافی توحید ہے اس لئے عارف کامل بذریعہ شہود اس کو سمجھ سکتا ہے مگر الفاظ کو وہاں کچھ دخل نہیں۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ سے توحید کی بابت جب سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مقام توحید اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ آثار بشریت بالکلیت مضمحل اور تمام علوم منفی ہو جائیں اور صرف ذات واحدہ ہو جو ازلی و ابدی ہے منصور مغربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے جامع منصور عباسی واقع بغداد میں حضرمی کو توحید کے بارہ میں کلام کرتے سنا جب میں سویا تو مجھے رویا میں دو ملائکہ نظر آئے جو آسمان کی طرف جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا کہ حضرمی (منسوب بہ حضر موت جو بلاد یمن میں ہے) نے جو کچھ کہا ہے یہ اس کے علم کا نتیجہ ہے مگر توحید اس سے بالاتر ہے۔

یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ جو شخص توحید کے دریا میں تیرتا ہے اس کی پیاس اور بھی بڑھتی ہے۔

الغرض توحید ذات باری کا مقام ہم جیسے لوگوں کی قیل و قال سے بالاتر ہے اور جن اہل ظاہر نے اس میں کچھ کلام کیا ہے انہیں بجز ہوسناکی کے کچھ حاصل نہیں ہوا کم علم لوگ غلطی سے اپنی جگہ کچھ سمجھ کر اپنے تئیں عارف حقیقت سمجھنے لگ جاتے ہیں اور یہ عین ضلالت ہے حق یہ ہے کہ جس قدر کسی شخص کا مبلغ علم بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کو یہ مرحلہ سخت دشوار گذار نظر آتا ہے ونعم ما قیل۔

گمفتا غلطی زمانشاں نتواں داد ازما تو ہر آنچہ دیدہ پایہ تست

(شاعر نے اس شعر کو گویا ذات باری کا مقولہ قرار دیا ہے مطلب یہ کہ اے ہماری حقیقت کی ٹوہ لگانے والے ہمارا پتہ تمہیں نہیں ملے گا۔ جو کچھ تم سمجھو گے وہ تمہارا اپنا علم ہے حقیقت نہیں)

اس تمہید کے بعد اسماء احد و واحد کی ضروری تشریح کی جاتی ہے سو واضح ہو کہ اسم واحد سے کبھی تو نفی کثرت مراد لی جاتی ہے اور کبھی نفی ضد نفی کثرت کی صورت میں چند توجیہ بیان کی گئی ہیں اول یہ کہ واحد حقیقی وہ ذات ہے جو کسی صورت میں بھی تقسیم قبول نہ کرے نہ خارجی طور پر نہ ذہنی طور پر کیونکہ یہ خاصہ یا تو مادی اشیاء کا ہے یا اشیاء عقلی کا۔

استاد ابو اسحٰق کہتے ہیں کہ واحد ایک شے ہے وہ عدم تقسیم کی قید کو حذف کر گئے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جو چیز قابل تقسیم ہو ایک شے نہیں بلکہ دو شے کا مجموعہ ہے دوم یہ کہ واحد وہ ذات ہے کہ جس میں وضع اور رفع (کم کرنے اور دور کرنے) کو ہم تجویز کر سکتے ہوں مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں مرد بلادست و پا مگر واحد حقیقی کی نسبت ایسا خیال کرنا باطل ہے۔

سوم یہ کہ واحد وہ ذات ہے جو سلسلہ شمار میں نہ آسکے یعنی عدد کے تعلق سے بری ہے کیونکہ عدد ایک ایسی مقدار کو کہتے ہیں جو اپنی ہر دو اطراف

کے مجموعہ کا نصف ہو مثلاً چار نصف ہے تین اور پانچ یعنی آٹھ کا مگر واحد کی دو طرفین متحقق نہیں کیونکہ اس کی صرف ایک ہی طرف ہے اس لئے واحد سلسلہ اعداد میں شمار نہیں ہو سکتا بلکہ واحد تمام لامتناہی اکائیوں کا منبع ہے یہاں یہ خیال صحیح نہیں کہ جوہر فرد (جزلا یتجزے) کی طرح واحد حقیقی میں حقارت یعنی چھوٹا پن پایا جائے گا کیونکہ یہ امر محسوسات مادیہ کے متعلق ہے ذات باری اس سے بری ہے۔

دوسری صورت میں اس اسم کی تفسیر یہ ہو گی کہ کوئی موجود اس ذات حقیقی کے ساتھ وجوب ذاتی علم بجمیع الممکنات قدرت علی جمیع الممکنات میں مساوی نہیں اس لئے نہ تو کوئی موجود اس کا مثل ہے اور نہ نظیر اس لئے واحد حقیقی بھی اس ذات مطلق کے سوا کوئی موجود نہیں ہو سکتا۔

اسم احد کے متعلق زجاج نحوی کہتے ہیں کہ احد اصل میں واحد ہی ہے ازہری کی تحقیق کے مطابق زجاج نے اس کو وحد یوحد فھو وحد بروزن حسن یحسن فھوحسن سے مشتق کیا پھر وحد کی واؤ کو ہمزہ سے بدل کر احد کہنے لگے جیسے وسماء (خوبصورت عورت) کو اسماء بول دیا کرتے ہیں خلیل کا مذہب بھی یہی ہے۔

واضح ہو کہ احد اور واحد میں تین طرح فرق ظاہر کیا جا سکتا ہے اول یہ کہ واحد سلسلہ شمار کے آغاز کو کہتے ہیں یعنی واحد اثنان ثلاثہ تو بول سکتے ہیں مگر احد و اثنان و ثلاثہ نہیں بول سکتے۔

دوم یہ کہ احد سے جو عموم نفی کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ واحد سے نہیں ہو سکتا مافی الدار واحد بل ثنان تو صحیح ہے اور مافی الدار احدبل اثنان غلط ہو گا۔

سوم یہ کہ لفظ واحد کسی چیز کی صفت واقع ہو سکتا ہے رجل واحد' ثوب' واحد وغیرہ مگر بصورت اثبات لفظ احد بجز ذات باری کے کسی چیز کی صفت واقع نہیں ہو سکتا مثلاً یہ تو کہہ سکتے ہیں الله احد مگر رجل' احد' اور

ثوب احد نہیں کہیں گے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ احد ذات باری کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لئے اس پر لام التعریف لانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی مگر نفی کی صورت میں یہ لفظ واحد کی طرح غیر اللہ کی صفت میں بھی آجایا کرتا ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ لفظ احد کی جمع آحاد ہے مگر ازہری کہتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ سے اس جمع کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ معاذ اللہ اگر احد کی جمع آحاد تجویز کی جائے اور بعض علماء کا خیال ہے کہ آحاد واحد کی جمع ہے جیسے اشہاد جمع شاہد کی۔

سورہ اخلاص کے الفاظ ھو اللہ احد کی ترتیب پر غور کرنا چاہیے کیونکہ ان ہرسہ الفاظ کی ترتیب موجودہ علیحدہ علیحدہ مقامات کی طرف اشارہ کرتی ہے سب سے اول اور سب سے اعلیٰ مقام ان حضرات مقربین کا ہے جنہوں نے حقائق اشیاء کو چشم بصیرت کا مشاہدہ کر کے انہیں معدوم اور موجود بوجود حق پایا ہے یہ حضرات بجز ذات حقیقی کے کسی موجود کو فی الحقیقت موجود نہیں دیکھتے اس لئے بجز اس ذات واحد کے کوئی موجود فی الحقیقت مشارالیہ ہو ہی نہیں سکتا سو اس مقام میں لفظ ھو کا مشارالیہ در حقیقت متعین ہے بجز اس ذات واحد کے کسی اور کا گمان ہی نہیں جاتا اس مقام سے دوسرے درجہ پر اصحاب الیمین کا مقام ہے جو ذات واحد کے سوا دیگر ممکنات کو بھی موجود مانتے ہیں اس لئے اشارہ میں ممیّز کی ضرورت داعی ہوتی ہے چنانچہ لفظ اللہ نے مشارالیہ کو اغیار سے متعین کر دیا اور ھو اللہ ان کے لئے کافی ہو گیا۔

تیسرے درجے پر اصحاب الشمال میں جو بجز کثرت کے کچھ اور مشاہدہ نہیں کر سکتے اور وحدت خالص کے ساتھ کثرت کو لازم جانتے ہیں اور ذات باری میں کثرت کے قائل ہیں لہذا ان کے لئے ضرورت نفی کثرت کی داعی ہوئی کیونکہ لفظ احد ہی ہے یہ نفی ہو سکتی ہے نہ کسی اور لفظ سے اس لئے ان کو یوں سمجھایا ھو اللہ احد۔

اس مقام میں اس نکتہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ذات باری کے صفات دو قسم کے ہیں اول اضافیہ جیسے عالم قادر خلاق دوم سلبیہ مثلاً یہ کہ وہ جسم نہیں یا جوہر نہیں یا عرض نہیں وغیر ذلک اور تمام مخلوقات اولا صفات اضافیہ پر دلالت کرتی ہے اور پھر صفات سلبیہ پر اس لئے جملہ ھو اللہ احد تمام صفات معتبرہ پر بروجہ کمال دلالت کرتا ہے کیونکہ صفات قابل اثبات اور صفات قابل سلب ہر دو کا جامع ہے کیونکہ اسم اللہ جمیع کمالات مثبتہ پر مشتمل ہے اور اسم احد تمام صفات سلبیہ پر مگر حق یہ ہے کہ توحید ذات باری کی حقیقت کے بیان میں الفاظ کوتاہ ہیں چنانچہ ہم نے گذشتہ سطور میں اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے ولنعم ما قیل

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

صاحب قال ہزاروں ہیں مگر کچھ مفید نہیں اور صاحب حال کوئی شاذو نادر ہی ہوتا ہے مگر تمام مشکلات کو آسان کر دیتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ سے مروی ہے کہ توحید ایک حقیقت ہے جس سے رسوم بشریت محو اور علوم بالکلیت معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وجود ذات باری جو ازلی و ابدی ہے باقی رہ جاتا ہے یوسف بن حسین کہتے ہیں کہ جو شخص توحید کے دریائے ناپیداکنار میں تیرتا ہے اس کی پیاس روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے۔

بعض حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو سیادت میں بدرجہ کمال پہنچ گئی ہو اور جس کا مثل ناپید ہو اور نہ اس کا کوئی شریک ہو جو اس کے ساتھ مساوات رکھتا ہو شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو بندہ کو تمام مخلوق سے کافی ہو سکے اور تمام مخلوق اس ذات سے کافی نہ ہو سکے حسین بن منصور حلاج کہتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو سلسلہ شمار میں نہ آسکے اور بعض لکھتے ہیں کہ احد وہ ذات ہے جو ایجاد معدومات میں یگانہ اور اظہار خفیات

میں یکتا ہو بعض نے لکھا ہے کہ احد وہ ذات ہے کہ جس کے وجود کی نہ تو غایت ہو اور نہ اس پر کسی کا حکم جاری ہو سکتا ہو اور کوئی اس کی امداد نہ کر سکے تفسیر احد میں شبلی علیہ الرحمتہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ ایک دفعہ ایک تاجر کی دکان پر بیٹھے تھے لوگوں نے کہا کہ آپ حساب جانتے ہیں فرمایا کہ ہاں انہوں نے بہت سے کاغذات حساب لا کر رقوم لکھنا شروع کیں جب وہ لوگ لکھا چکے تو دریافت کیا کہ کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا ایک وہ لوگ تعجب کرنے لگے آپ نے فرمایا کہ تعجب کیوں کرتے ہو ازل سے ابد تک بجز ایک کے کوئی اور بھی ہے عبد خالص واحد اس وقت ہوتا ہے جبکہ طے مقامات میں اپنی ابنائے جنس میں بےنظیر ہو جاوے اور اگر کسی ایک وصف میں یگانہ ہو تو اس وصف کے لحاظ سے وہ واحد کہلائے گا مگر جمیع اوصاف میں بےنظیر بجز ذات گرامی جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہاں اضافی کمالات اولیاء اللہ کو حاصل ہیں الغرض واحد حقیقی بجز ذات باری کے کوئی مخلوق نہیں۔

خاصیت

اگر ہزار بار پڑھے تعلق مخلوق کا اس کے قلب سے زائل ہو جاوے۔

اشهدان لا اله الا الله وحده لا شريك له الها واحدا احدا صمدا
لم يتخذ صاحبة ولا ولداولم يكن له كفوا احد. (ترمذی)

اَلصَّمَدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الصَّمَدُ اس اسم کی توجیہ دو طرح پر مشہور ہے اول تو یہ کہ صمد جس کا وزن صرفی فعل ہے بمعنی مفعول مستعمل ہے جس کے معنی ہیں من صمد الیہ یعنی وہ شخص جس کی طرف لوگ اپنی حاجات کو لیجائیں عرب بولتے ہیں بیت مصمود وبیت مصمد اذا قصده الناس فی حوائجهم یعنی ایسا گھر جہاں لوگ اپنی حاجات کے لئے رجوع کریں طرفہ کہتا ہے

وان يلتق الحی الجميع تلاقنی
الی ذروة البيت الرفيع المصمد

امام لیث فرماتے ہیں کہ عرب بولتے ہیں صمدت صمد هذا الامرای قصدت قصده

دوم یہ کہ صمد ایسی چیز کو بولتے ہیں جو ٹھوس ہو یعنی اندر سے خالی نہ ہو چنانچہ شی مصمد ایسی چیز کو بولتے ہیں جو سخت ہو اور جس میں نرمی نہ ہو بعض متاخرین اہل لغت لکھتے ہیں کہ صمد سپاٹ پتھر کو بولتے ہیں جو غبار سے پاک ہو

اور جس کے اندر کوئی چیز نفوذ نہ کر سکے اور نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر آسکے ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حرف دال حرف تاء کا بدل ہے سلف صالحین کا ایک گروہ اور بعض اہل لغت معنی ثانی کی تائید کرتے ہیں مگر ایک جماعت سلف اور خلف کی معنی اول کی طرف مائل ہوتی ہے شعبی کہتے ہیں کہ صمد اس سردار کو بولتے ہیں جو سیادت میں کامل ہو اور ابو اسحٰق کوفی عکرمہ سے راوی ہیں کہ صمد وہ ذات ہے جس سے بالاتر کوئی اور نہ ہو۔ اور علی اور کعب ابن الاحبار رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جس کی نظیر اس کی مخلوق میں معدوم ہو اور سدی سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو حصول مرغوبات کے لئے مرجع اور دفع مصائب کے لئے مستغاث بہ قرار پا سکے بالجملہ اس اسم کی اور بھی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں نظر بطول کلام ہم نے نظر انداز کر دیں ہاں صمد بمعنے سردار محتاج الیہ اہل عرب کے ہاں مستعمل ہے چنانچہ شعر ذیل میں۔

الابکر الناعی بخیر بنی اسد

بعمر وبن مسعودو بالسید الصمد

بعض جاہلوں نے لفظ صمد سے یہ استدلال کیا ہے کہ ذات باری جسم ہے مگر یہ سراسر باطل ہے کیونکہ اس کا احد ہونا اس خیال کی تکذیب کرتا ہے جسم اجزاء سے مرکب ہے اور جو مرکب ہے قابل تقسیم ہے اور تقسیم احدیت کی منافی ہے اور بس۔

ابو بکر وراق فرماتے ہیں کہ صمد وہ ذات ہے کہ خلقت جس کی کنہ کے دریافت کرنے سے عاجز ہو اور عقول جس کے اسرار حکمت کو نہ پا سکیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جب کسی کو منتخب فرما لیتا ہے تو وہ کامل طور پر اسم صمد کا مظہر قرار پاتا ہے جس سے وہ اہل عالم کے دینی اور دنیوی حوائج کے لئے مرجع بن جاتا ہے اور وہ ان کے حاجات کو رفع کرتا ہے۔

خاصیت

آخر شب میں ایک سو پچیس بار پڑھے تو آثار صدق و صدیقیت کے ظاہر ہوں اور جب تک اس کا ذکر کرتا رہے بھوک کا اثر نہ ہو۔

دعاء

اللهم انی اسالك انی اشهدانك انت الله لا اله الاانت الاحد الصمد الذی لم يلدولم يولد ولم يكن له كفواً احد. (ترمذی)

اَلقَادِرُ اَلمُقتَدِرُ

جل جلالہ   جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالی هُوَ الْقَادِرُ مصدر قدرت سے مشتق ہے اور قدر یقدر کبھی بمعنی مقدر کے بھی مستعمل ہوتا ہے یعنی قدرتہ بمعنی قدرتہ (اندازہ کروم) قال اللّٰہ تعالی فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ یعنی قَدَرْنَا فَنِعْمَ المقدرون اسی معنی کا استعمال ہوا ہے کہ ہم ان کی خطا پر انہیں باز پرس نہیں کریں گے ورنہ قدرت سے مشتق کرنے کی صورت میں آیت کے معنی صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک نبی اللہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا اسم قدیر اسم قادر کا مبالغہ ہے جیسے عالم اور علیم مگر قدیر اسماء حسنی میں شمار نہیں کیا گیا اگرچہ قرآن مجید میں وارد ہو چکا ہے۔

اسم مقتدر بھی بہ نسبت قادر کے معنی مبالغہ پر مشتمل ہے قال اللّٰہ تعالیٰ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ اور اس کی نظیر ہے لَهَا مَاكَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس آیت میں کسب کو خیر کے ساتھ اور اکتساب کو شر کے ساتھ ذکر کرنے میں یہ خوبی ہے کہ شر سے انسان بذریعہ وعظ اور دلائل شرعیہ کے روکا جا سکتا ہے۔

اس کے لئے بڑی قدرت کی ضرورت ہے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ اقتدار بہ نسبت قدرت کے مبالغہ کو ظاہر کرتا ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قادر وہ ذات ہے جو اپنی مشیت کے مطابق خواہ کسی امر کو کرے خواہ نہ کرے ہر دو پر یکساں اختیار اور قدرت رکھتا ہو چنانچہ اس کمال اختیار قدرت کے لئے یہ شرط نہیں کہ قادر ضرور کسی امر کو کر ہی ڈالے کیونکہ کرنا اور نہ کرنا اس کی صفت حکمت کے تابع ہے اس لئے اگر وہ کسی امر کو کر ہی ڈالے تو اس کی حکمت پر مبنی ہو گا اور اگر نہ کرے تو بھی اس کی حکمت کا مقتضے ہوگا اور قادر مطلق وہی ہو سکتا ہے جو اشیاء کو عدم سے وجود میں بلا معاونت غیر لا سکے اور یہ وصف بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہاں عبد کامل کو بھی فی الجملہ قدرت ناقصہ دی گئی ہے جس کو ایجاد و اعدام میں کچھ دخل نہیں بلکہ عبد صرف اسباب مناسبہ کے پیدا ہونے پر ان میں تصرف کر سکتا ہے اور بس۔

خاصیت

القادر

القادر دو رکعت پڑھ کر اس کو سو بار پڑھے تو اس کو قوت حاصل ہو اور اگر وضو کرتے ہوئے اس کی کثرت کرے تو دشمنوں پر غالب ہو۔

المقتدر

جب سو کر اٹھے اس کی کثرت کرے تو جو اس کی مراد ہو اس کی تدبیر اللہ تعالیٰ آسان کر دیں۔

اَلْمُقَدِّمُ اَلْمُؤَخِّرُ

جل جلالہ — جل جلالہ

تقدم اور تاخر کی دو قسمیں ہیں ذاتی اور وضعی پھر ذاتی کی دو صورتیں ہیں اول علت کا اپنے معلول پر مقدم ہونا جیسے انگلی کی حرکت کا انگوٹھی کی حرکت پر مقدم ہونا اور شرط کا اپنے مشروط پر مقدم ہونا جیسے حیات جو شرط علم ہے اور وضعی کی تین صورتیں ہیں اول تقدم زمانی جیسے ذات باری کے بعض افعال کا بعض پر مقدم ہونا جن کی قبلیت اور بعدیت صرف اسی کے تعلق پر مبنی ہے ورنہ فی حد ذاتہ نہ تو اس کا کوئی فعل متقدم ہے نہ متاخر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ افعال ذات باری کا متقدم و متاخر ہونا سلسلہ سبب و مسبب کے قائم کرنے کی حکمت پر مبنی ہے دوم تقدم مکانی مثلاً آسمان کا فوق اور زمین کا تحت حالانکہ اس کا برعکس بھی متصور تھا مگر اس کی حکمت کاملہ کا اقتضاء یوں ہی تھا سوم تقدم بالشرف یعنی بعض مخلوق کو بعض دیگر پر بلحاظ صفات کاملہ کے شرف کا حاصل ہونا اور اس لئے وہ متقدم ہو گا بہ نسبت اس مخلوق کی جس میں وہ صفات موجود نہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مقدم و موخر وہ ذات ہے جو کسی مخلوق

کو اپنا قرب عطا فرماوے اور کسی دوسری مخلوق کو اپنی بارگاہ قرب سے بعید کر دے چنانچہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اپنی بارگاہ میں قرب بخشا ہے اور ان کے مخالفین کو اپنے قرب سے دور پھینک دیا ہے اس قرب و بعد میں بہت سے مدارج ہیں چنانچہ ہر ایک مقرب بہ نسبت اپنے سے متقدم کی متاخر کہلاتا ہے اور ہر ایک متاخر متقدم اور اس تمام سلسلہ تقدم و تاخر کی غایت ذات باری پر ختم ہو جاتی ہے اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى اور وہی ذات باری جو مفیض الخیرات ہے کسی کو قریب کرتی ہے اور کسی کو بعید اور ان ہر دو اسم میں اشارہ ہے کہ کوئی شخص بذریعہ علم و عمل مقرب نہیں بن سکتا جب تک اس کا فضل شامل حال نہ ہو قال اللہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ انسان کامل کو ان ہر دو اسم سے یہ بہرہ ہے کہ وہ مخلوقات میں ان کی خصوصیات کے لحاظ سے قرب و بعد کے مدارج قائم کرے اور ترتیب افعال کو مد نظر رکھے۔

خاصیت

المقدم

معرکہ میں جا کر پڑھے تو قوت اور نجات ہو۔

الموخر

کثرت سے پڑھے تو برے کاموں سے توبہ نصیب ہو۔

دعاء

اللھم لك سجدت وبك آمنت ولك اسلمت سجدوجھی للذی خلقه وصوره وشق سمعه وبصره تبارك الله احسن الخالقين نم يقول من اخرما يقول بين التشهد والتسليم اللهم اغفرلى ماقدمت وما اخرت وما اعلنت وما اسرر ت وما انت اعلم به منى انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت. (ترمذی)

الاول الآخر

جل جلالہ جل جلالہ

کوئی ایک چیز ایک ہی جہت سے کسی امر مخصوص کی نسبت اول و آخر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا اول ہونا کسی اور جہت سے ہو گا اور آخر ہونا کسی دوسری جہت سے کیونکہ دو متضاد امور کا مصداق ایک ہی چیز نہیں ہو سکتی جب ہم سلسلہ کائنات کی ترتیب میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ وجود میں ذات باری سب سے اول ہے کیونکہ تمام موجودات نے اس سے لباس ہستی لباس پہنا اور خود بذاتہ موجود ہے مگر منازل معرفت میں وہ تمام اشیاء کی معرفت کا آخری مقصد ہے کیونکہ گذشتہ صفحات میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی چیز بجز ذات باری کے مطلوب حقیقی نہیں ہو سکتی بلکہ جن اشیاء کی معرفت ہم حاصل کرتے ہیں وہ آئندہ حقائق معرفت کے لیے بطور شرط کے ضروری ہیں اور غائت حقیقی معرفت ذات باری ہے لہذا وہ ذات مقدس وجود میں سب سے اول اور معرفت میں سب سے آخر ہے یہی معنے ہیں اس جملہ کے وہی ذات مبدء ہے اور وہی مرجع اہل دل نے ان اسماء کی تشریح میں مختلف اشارات کئے ہیں مثلاً (ا) وہ ذات مقدس اول ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں اور آخر ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں۔

(ب) وہ ذات مقدس اول ہے ایجاد خلق میں اور آخر ہے ہدایت و توفیق میں (ج) اول بالذات ہے اور آخر بالصفات (د) اول ہے وجوب و قدم کے رو سے آخر ہے حدوث و عدم سے پاک ہونے کی وجہ سے (ہ) اول ہے بلحاظ محبت سابقہ کے اولیاء کے حق میں آخر ہے بلحاظ غضب سابق کے اعداء کے حق میں وغیر ذلک۔

واضح ہو کہ ذات باری کے متعلق سوال کی کئی ایک صورتیں ہیں مثلاً کیا وہ موجود ہے اس کا جولبدیا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِ وَیُمِیْتُ وہ کس طرح ہے؟ اس کا جواب دیا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وہ کیا ہے؟ رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَائِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ اس میں اشارہ ہے کہ اس کی معرفت کا طریق یہی دلائل قطعیہ ہیں جو اس کے وجود پر دال ہیں وہ کس قدر ہے؟ اس کا جواب دیا وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وہ کہاں ہے؟ اس کا جواب دیا اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کا جولبدیا لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ وہ کیا چیز ہے؟ اس کا جواب دیا ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا یعنی کوئی چیز ذات صفات میں اس کی نظیر نہیں وہ کب سے ہے؟ اس کا جواب دیا ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ اس کا تصرف کس قدر ہے؟ اس کا جواب دیا قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ الایۃ اس کا علم کس قدر ہے اس کا جواب دیا عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ اسکا کلام کس قدر ہے اس کا جواب دیا۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ اس کے اسماء کیا ہیں؟ اس کا جواب دیا لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

خاصیت

الاول

اگر مسافر ہر جمعہ کو ہزار بار پڑھے تو جلدی اپنے لوگوں سے آملے

الآخر

اگر ہر روز ہزار بار پڑھے تو ماسوی اللہ دل سے نکل جاوے۔

الظّاهِرُ البَاطِنُ

جل جلالہ

یہ ہر دو اسم بھی مذکورہ بالا ہر دو اسم کی طرح منجملہ امور اضافیہ کے ہیں یعنی کوئی چیز ایک ہی جہت سے ظاہر و باطن نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک ہی چیز ایک خاص شخص کے ادراک کی نسبت ظاہر کہلا سکتی ہے اور دوسرے شخص کے ادراک کی نسبت باطن سو ذات باری ادراک حواس کے رو سے باطن ہے اور استدلال عقل کے رو سے ظاہر۔ مگر یہاں یہ سوال عائد ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ظاہر ہے تو کیوں اس کے ادراک میں اس قدر اختلافات دنیا میں موجود ہیں؟

اس سوال کا جواب امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ یوں قلمبند کرتے ہیں کہ ذات باری عزاسمہ غایت ظہور کی وجہ سے مخفی ہے یعنی اس کا بدرجہ غایت ظاہر ہونا اس کے مخفی یا باطن ہونے کا سبب ہے یا یوں کہو کہ اس کا نور ہی اس کے نور کا حجاب بن رہا ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز کسی وصف میں درجہ متعارف سے بدرجہ کمال متجاوز ہو جاتی ہے' وہ اس وصف کی ضد سے موصوف معلوم ہونے لگتی ہے اس کی تفصیل یوں سمجھو کہ اگر ہم حروف کو کاغذ پر منقوش دیکھیں تو ہمیں مجرد دیکھنے کے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان حروف کا کاتب عالم' قادر' سمیع

بصیر ہے یا یوں کہو کہ کاتب کو صفات علم' قدرت' سمع' بصر سے موصوف ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اگر کاتب یہ صفات نہ رکھتا ہو تو وہ کاتب حروف نہیں ہو سکتا جس طرح ہم لکھے ہوئے حروف سے ان کے لکھنے والے کے نہ صرف وجود کا یقین حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس کو مذکورہ بالا صفات سے موصوف تسلیم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں اس طرح صفحہ ہستی پر ایک ایک ذرہ کائنات کا خواہ زمینی ہو یا آسمانی اپنی زبان حال سے نہ صرف اپنے خالق اور مدبر کے وجود کی طرف اشارہ کر رہا ہے بلکہ اس کے کامل الصفات ہونے کی بھی شہادت دے رہا ہے اور خود انسان کا ایک ایک عضو جو اندرونی ہو یا بیرونی بلکہ اس کی ایک ایک صفت اور حالت جن پر وہ اپنی زندگی کی رفتار کو طے کر رہا ہے قطعی طور پر اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ان کا ایک خالق قاہر مدبر موجود ہے اگر اس شہادت میں اختلاف ہوتا یعنی اگر بعض اشیاء وجود خالق پر شاہد ہوتیں اور بعض نہ ہوتیں تو وجود خالق میں کچھ اختلاف نہ ہوتا مگر جب ایک ایک ذرہ کائنات کا وجود خالق پر دلیل قطعی ہے۔

وفی کل شی له ایة   تدل علی انه واحد

تو کچھ شک نہیں کہ یہی امر لوگوں کے لئے ادراک خالق میں موجب اختلاف ہو رہا ہے اور غایت ظہور کی وجہ سے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ دیکھو محسوسات خارجیہ میں سب سے واضح الادراک جرم آفتاب ہے جو تمام اشیاء عالم کے ظہور کا موجب ہے کیونکہ اس کے غروب پر تمام اشیاء آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم نور سے ہمیں نور کا علم حاصل ہوتا ہے اگر آفتاب وسط آسمان میں ٹھہرا رہتا اور نقل و حرکت نہ کرتا تو بہت سے لوگ ایسے ہوتے جو یہ کہتے کہ اشیاء خود بخود روشن ہیں آفتاب ان کے ظہور کا موجب نہیں اسی طرح اگر ذات باری اپنا فیضان وجود ایک آن کے لئے بعض اشیاء سے روک لے تو فی الفور وہ اشیاء حیز عدم میں مخفی ہو جائیں مگر چونکہ تمام اشیاء یکساں طور پر خالق حقیقی کے وجود پر دال ہیں اور ان کی شہادت میں

کچھ اختلاف نہیں تو بھی یکسانیت لوگوں کے لئے موجب اشتباہ ہو گئی متضاد حالتوں کے مشاہدہ کئے بغیر اور احد الضدین کا علم حال نہیں ہو سکتا مگر عالم کائنات میں عدم کا کہیں نشان نہیں ہر ایک چیز موجود ہے اور جو موجود ہے وہی اپنے خالق مدبر کے وجود پر دال ہے اس لئے وہ ذات حقیقی غایت ظہور کی وجہ سے آفتاب کی طرح مخفی ہے کیونکہ آفتاب تمام موجودات کے ظہور کا موجب ہے مگر قوت باصرہ اس کی تاب نہیں لا سکتی۔ بعض اہل حقیقت کی عبارات میں ذیل کا جملہ واقع ہوا ہے جو مذکورہ بالا حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے حیث قال

سبحن من اختفى عن العقول بشدة ظهوره واحتجب بكمال نوره

اسم باطن کی توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ کنہ ذات باری خلائق پر مخفی ہے یا یہ کہ ابصار اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں یا یہ کہ اس ذات حقیقی کا علم تمام مخفیات پر محیط ہے کچھ ہو ظہور و بطون کی وصف حقیقۃ اسی ذات پر صادق آسکتی ہے ہاں انسان بھی ظاہر ہے جبکہ وہ ظواہر کائنات سے استدلال کر کے معرفت ذات باری کو حاصل کرے اور وہ باطن ہے جبکہ وہ اپنے نفس کی طرف رجوع کر کے انوار تجلیات کا مورد بن جائے۔

خاصیت

الظاہر اشراق کے وقت بکثرت پڑھے تو قلب میں نور ولایت ظاہر ہو۔

الباطن ہر روز تین بار ایک گھنٹہ تک اس کو پڑھے تو کیفیت انس کی حاصل ہو۔

دعاء اللهم رب السموات ورب الارض ورب العرش العظيم ربنا ورب كل شيئى فالق الحب والنوى ومنزل التوراة والانجيل والفرقان اعوذبك من شركل شيئى انت اخذ بناصيته اللهم انت الاول فليس قبلك شيى وانت الاخر فليس بعدك شئى وانت الظاهر فليس فوقك شيئى وانت الباطن فليس دونك شيئى ان اقض عنا الدين واغننامن الفقر. (حصن حصين)

اَلْوَالِیُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن شریف میں وارد نہیں ہوا اور اس کے معنے اس ذات کے ہیں جو اشیاء پر غالب ہو اور ان میں اپنی مشیت کے مطابق کامل تصرف کر کے اسم ولی میں اس کی تشریح مذکور ہے۔

خاصیت

اس کی کثرت کڑک بجلی سے محفوظ رکھتی ہے۔

اَلْمُتَعَالِیْ

جل جلالہ

یہ اسم علو مصدر سے مشتق ہے اور اس کے معنے وہی ہیں جو اسم علی کے ہیں ہاں متعال میں مبالغہ کا مفہوم بھی داخل ہے۔ اسم علی کا مطالعہ کرو۔

خاصیت

اس کے ذکر سے رفعت اور درستی حاصل ہو۔

اَلْبَرُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ بر بالکسر مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی نکوئی اور احسان کے ہیں اس لئے بر کے معنے محسن کے ہوئے۔ یحیٰ علیہ السلام کی وصف میں وارد ہوا ہے۔ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ اور مسیح علیہ السلام کی صفت میں بَرًّا بِوَالِدَتِیْ آیا ہے۔

واضح ہو کہ بر اور بار کے ایک ہی معنی ہیں اور بر یعنی محسن فی الحقیقت بجز ذات باری کے کوئی مخلوق نہیں کیونکہ اس کے احسانات بلا معاوضہ ہیں جن کا کبھی حصر نہیں کیا جا سکتا اور وہ دو قسم کے ہیں دینی اور دنیوی اور پھر ان میں سے ہر ایک ظاہری ہے اور باطنی کما قال اللہ تعالیٰ "وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً"۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک قسم کے اعمال بر میں مستقیم الحال ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے آیۃ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الآیۃ میں جمع کر دیا ہے اور تکمیل بر کی شرط یہ ہے کہ سب سے احسن اور ہر محبوب چیز کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں صرف کیا جائے قال

اللہ تعالیٰ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور تمام اقسام بر سے اعلیٰ اور اشرف بر وہ ہے جو والدین کے حق میں کی جاتی ہے قال اللہ تعالیٰ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا دیکھو مذکورہ بالا آیات میں یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے وصف بر سے یاد کیا ہے اور اپنے اساتذہ و مشائخ سے نکوئی اور احسان برتنا بھی اسم بر کا مقتضی ہے اور کمال بر یہ ہے کہ عبد اپنے احسان کو کسی محل خاص سے مخصوص نہ کرے بلکہ بر خداوند تعالیٰ کا تتبع کرنا ضروری ہے جس کا حصر کرنا منجملہ محالات کے ہے ابن عمر سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا البر لا یبلی یعنی نکوئی کبھی بوسیدہ نہیں ہوتی۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ بر وہ ذات ہے جو اصحاب ارادت پر کشف طریق اور اصحاب عبادت کو اپنے فضل و توفیق سے بہرہ یاب کرے بعض لکھتے ہیں کہ بر وہ ذات ہے جو معصیت کی وجہ سے بندہ سے اپنا انعام و احسان منقطع نہ کرے۔

خاصیت

اگر سات مرتبہ پڑھ کر بچہ پر دم کیا کرے تو نیک بخت اٹھے۔

۞

التَّوَّابُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اور پھر فرمایا هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ اس اسم کی تشریح میں وجوہ ذیل بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ تاب و آب واناب ہر سہ بمعنی رجع آیا کرتے ہیں اس لئے تواب کے معنے ہوئے وہ ذات جو اپنے بندوں پر انواع احسانات کے ساتھ رجوع کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ بندہ جب مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی صورت رہائی کی نہیں سوجھتی تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ازلی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور اس کو راہ ہدایت پر لا کر گناہ سے بالکلیت بر طرف کر دیتی ہے جس کا پہلا نشان ہے کہ تائب کے دل پر خشیت و عبودیت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ مقام حساب میں ہر وقت اپنے تئیں کھڑا دیکھتا ہے چنانچہ وہ اپنی اصلاح ظاہری و باطنی کی طرف لگ جاتا ہے جس سے وہ ان انعامات باطنی کا مستحق ہو جاتا ہے جن سے بوجہ معصیت پہلے محروم تھا اور ہر ایک قسم کی تنگی اور مصیبت کو اس سے دور کر دیا جاتا ہے الغرض ادھر بندہ معصیت سے رجوع کرتا ہے ادھر اللہ تعالیٰ اپنے انعام و اکرام سے اس کو بہرہ یاب کرنے لگتا ہے اور

یہی معنے ہیں اسم تواب کے مگر معصیت سے باز آنا جائے خود توفیق خداوندی پر منحصر ہے جس کو چاہتا ہے خالص توبہ کا مقام عطاء فرماتا ہے ورنہ بندہ خود اپنی محنت و سعی سے کبھی صاحب تقوی نہیں ہو سکتا۔

جہاں آفرین گرنہ یاری کند
کجا بندہ پرہیز گاری کند

دوم یہ کہ لفظ توبہ لازم و متعدی ہر دو طریق پر مستعمل ہے یقال تاب اللّٰه على العبد بمعنے انه وفقه للتوبة حتى تاب قال اللّٰه تعالى ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوبُوٓاْ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق توبہ دی تاکہ وہ توبہ کریں اس لئے اسم تواب کے معنے ہوئے وہ ذات جو اپنے بندوں کو طاعت کی توفیق دے۔

سوم توبة اللّٰه على العبد کے معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرما لیتا ہے انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ بندگان خدا میں سے مجرمین کے عذر کو قبول کر کے ان سے درگذر کر جائے خواہ وہ کتنی دفعہ مجرم ثابت ہوں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ تواب وہ ذات ہے جو بندہ کی دعا کے مقابلہ میں عطا اور عذر کے مقابلہ میں مغفرت او رانابت کے مقابلہ میں اجابت نازل فرماوے۔

خاصیت

بعد نماز چاشت ۳۶۰ بار پڑھے تو توبہ کی توفیق حاصل ہو اور اگر ظالم پر دس بار پڑھے تو اس سے خلاصی ہو۔

دعاء

رب اغفرلی وتب علی انك انت التواب الغفور (ترمذی)

اَلۡمُنۡتَقِمُ

جل جلالہ

قال اللّٰه تعالىٰ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انۡتِقَامٍ اسم منتقم اسی سے مشتق ہے اور انتقام ذات باری سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا معصیت اور کفر پر بندہ کو اس معرض عذاب میں لانا جس کا وہ مستوجب ہے اور بندہ مستوجب عذاب نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی خوف اس کے دل میں باقی ہو اور جب بندہ غضب الٰہی اور اس کے مواخذہ سے غافل ہو کر بے لگام ہو جاتا ہے اور کھلم کھلا ارتکاب معاصی پر اترتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب بصورت عذاب اس پر نازل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوری فطرت کا علم رکھتا ہے اس لئے وہ بندہ کو ایک کافی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ رجوع الی اللہ کر کے اپنے تئیں عذاب سے بچالے اور یہ اس کے وسیع حلم کا نتیجہ ہے مگر جب حجت کے تمام پہلو اس پر پورے کر دیئے جاتے ہیں اور عذر کا کوئی موقع نہیں رہتا تو وہ اپنے بطش شدید کو عمل میں لاتا ہے جس کو کوئی ٹالنے والا نہیں یہی وجہ ہے کہ کلام پاک میں فرمایا کہ ہم اپنے رسول بھیجے بغیر کبھی عذاب نازل نہیں کرتے۔ اس موقع پر اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بعض اہل ظاہر عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص باوجود انواع و

اقسام معصیت کے ہر ایک قسم کی رفاہیت و امن میں زندگی بسر کر رہا ہے اور اس پر کوئی وبال نہیں آتا مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ در حقیقت اس شخص پر اتمام حجت ہو رہا ہے تاکہ تمام مراتب عصیان کو طے کر کے پورے پورے عذاب کا مستوجب قرار پائے اگر فی الفور ارتکاب گناہ پر پکڑا جاتا تو عذاب شدید کا مورد نہ بنتا الغرض نزول عذاب کے لئے غضب الٰہی کا حد سخط کو پہنچنا ضروری ہے قال اللہ تعالیٰ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبد اسوقت اس اسم کا مظہر کامل ہوتا ہے جب وہ دشمنان دین سے انتقام لے اور سب سے بڑھ کر دشمن انسان کا نفس ہے اس لئے سب سے زیادہ مورد انتقام نفس ہونا چاہیے چنانچہ شیخ ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت مروی کہ ایک رات اور اد مقررہ سے نفس نے غفلت کی آپ نے سال بھر اسے پانی سے محروم رکھا۔ فضیل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص خوف رکھتا ہے اس پر ہر ایک قسم کی نیکی آسان ہو جاتی ہے جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبد کو چاہیے کہ بیمار کی طرح پرہیز کا پابند ہو ایسا نہ ہو کہ ایک بد پرہیزی سے مدتوں بیماری کا خمیازہ بھگتنا پڑے بعض مشائخ نے لکھا ہے کہ منتقم وہ ذات ہے جس کا انتقام اس کی نعمت سے علیحدہ نہ ہو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نعمت ہی کو نقمت بنا دیتا ہے اور بعض عارفین نے لکھا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عظمت کو جان لیتا ہے وہ ہر وقت اس کے عذاب سے خائف رہتا ہے اور جو شخص اس کی رحمت کا علم حاصل کر لیتا ہے وہ اس کی نعمت کا امیدوار ہو جاتا ہے۔

خاصیت

جو شخص اپنے ظالم دشمن سے انتقام نہ لے سکتا ہو تو اس کی کثرت کرے اللہ تعالیٰ انتقام لے لیں۔

العَفُوُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا پھر فرمایا وَيَعْفُوْعَنِ السَّيِّاٰتِ اس اسم کی تفسیر میں مختلف وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) عفو کے معنے لغت میں مٹا دینے اور دور کرنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں عفت الدیار اذا درست یعنی جب گھر کے آثار بے نشان ہو جائیں اس صورت میں عفو خداوندی کے بمعنی ہوں گے اس کا بندہ کے گناہوں کو نامہ اعمال سے بالکلیت محو کر دینا اور قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ کرنا اور نہ صرف اسی قدر بلکہ بندوں کے دلوں سے انکا فراموش کر دینا کیونکہ میدان حشر میں گناہوں کی یاد بھی موجب خجالت وندامت ہو گی اور محو کرنے کے بعد ہر ایک سیئہ کے عوض حسنہ کا ثواب عطا فرمانا قال اللہ يَمْحُو اللّٰهُ مَايَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبُ اور پھر فرمایا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ

تنبیہ

عفو میں مغفرت کی نسبت مبالغہ کا مفہوم مندرج ہے کیونکہ عفو کے

معنے بالکل مٹا دینے کے ہیں اور مغفرت صرف مستور کر دینے کو بولتے ہیں جملہ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا میں غور کرو کہ کس طرح ہر سہ الفاظ کو ترتیب وار رکھا ہے کیونکہ عفو سے گناہوں کا نامہ اعمال سے مٹا دینا مراد ہے اور مغفرت سے مستور کر دینا تاکہ گناہ کی یاد موجب ندامت نہ ہو اور رحمت سے انعام جنت مراد ہے جو غایت الغایات ہے۔

(ب) عفو کے معنے زائد کے ہیں قال اللہ تعالیٰ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ اہل عرب بولتے ہیں عفا مال فلان اذاکثر اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ عفو وہ ذات ہے جو کثیر العطا ہو اور منعم علیہ کو محنت طلب کی تکلیف نہ دے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے جو اس کے حق میں ظلم کریں قصور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنے احسان کو ان سے نہیں روکتا اور نہ انہیں ان کی بدسلوکی یاد دلا کر نادم کرتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا جب عبد اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قصوروں کو معاف فرما دیتا ہے۔ چنانچہ ابن عاصم مقری کی نسبت مروی ہے کہ ان کے ایک غلام کے ہاتھ سے کباب جو گرم سیخ میں لگا تھا ان کے چھوٹے بچہ پر گرا جس سے بچہ مر گیا اپنے غلام سے کہا کہ جاؤ میں نے تمہیں فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے اپنے ایک غلام کو آواز دی غلام نہ آیا پھر پکارا پھر بھی غلام نے جواب نہ دیا تیسری دفعہ پکارا تب بھی غلام نہ بولا خود اٹھے اور غلام کو لیٹے پایا آپ نے پوچھا کہ تم نے میری آواز نہیں سنی؟ غلام نے عرض کیا کہ میں نے آواز سنی آپ نے پوچھا کہ تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے عفو و حلم پر اعتماد تھا لہٰذا خاموش رہا آپ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہیں فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ عفو وہ ذات ہے جو نفوس سے ظلمت

گناہ کو اپنی رحمت سے دور کر دے اور قلوب کی وحشت غفلت کو اپنی کرامت سے پاک کر دے۔

بعض مشائخ کی نسبت مروی ہے کہ بعد از مرگ انہیں کسی مرد صالح نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے آپ سے کیسا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ محاسبہ میں سخت دقت کی گئی اور بعد از محاسبہ عفو کلی سے کام لیا گیا۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرے تو گناہوں سے معافی اور رضائے الٰہی حاصل ہو۔

الرَّؤُفُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ اور پھر فرمایا بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ یہ اسم مصدر رافۃ سے مشتق ہے جس کے معنے شدت رحمت کے ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ آیات مسطورہ بالا میں اسم رؤف کو رحیم پر مقدم کیا گیا ہے اور جہاں یہ ہر دو اسم آئے ہیں اسی ترتیب سے آئے ہیں لہذا ان میں وجہ امتیاز کا سمجھنا ضروری ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رافت کا مبداء فاعل کی ذات میں ہوتا ہے یعنی رؤف کی ذات مقتضی ہوتی ہے کہ اپنے احسان کو شخص مرحوم تک پہنچائے اور رحمت کا مبداء مفعول کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یعنی مرحوم کی حالت فاقہ یا ضعف وغیرہ مقتضی ہوتی ہے کہ رحیم اس پر اپنی رحمت کرے اور یہ ظاہر ہے کہ ایجاد فعل میں فاعل کی حالت کو مفعول کی حالت کی نسبت زیادہ دخل ہوا کرتا ہے اسی مناسبت سے اسم رؤف کو رحیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ رؤف وہ ذات ہے جو گنہگاروں کے حق میں

توبہ اور اولیاء کے حق میں عصمت عطاء فرمادے اور بعض فرماتے ہیں کہ رؤف وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کو ملاحظہ اغیار سے محفوظ رکھے اور انہیں بار اشغال سے کافی ہو جائے۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ جناب پیغمبر کسی سفر کے موقع پر تشریف لے جارہے تھے ایک عورت بچہ گود میں لئے سامنے آئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر زیادہ مہربان ہے بہ نسبت ماں کے بچہ پر مہربان ہونے کے۔ کیا یہ سچ ہے؟ حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بجز منکر لاالہ الا اللہ کے کسی کو عذاب نہیں کرے گا۔

بعض صالحین سے مروی ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک بدکار آدمی رہتا تھا جب اس کا جنازہ اٹھایا گیا تو وہ جنازہ کو دیکھ کر راستہ سے علیحدہ ہو گئے تاکہ اس کے جنازہ میں شامل نہ ہونے پائے۔ ایک اور شخص نے اسے خواب میں نہایت آرام اور خوشی کی حالت میں دیکھا اس نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے کیسے سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اپنی رحمت سے مغفرت عطاء فرمائی اور کہا کہ میرے پڑوسی صالح مرد کو سنادو قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے خزانہ ہائے رحمت کے مالک ہو جاتے تو تم اس کے صرف کرنے میں ضرور تنگی کرتے۔

خاصیت

اپنے غصہ کے وقت یا دوسرے کے غصہ کے وقت دس بار اس کو پڑھے اور دس بار درود شریف تو غصہ کو سکون ہو جاوے۔

مَالِكُ الْمُلْكِ
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

جل جلالہ

اسم مالک الملک کی تفسیر گذشتہ صفحات میں بہ ضمن اسم جلیل گذر چکی ہے البتہ لفظ اکرام کی تفسیر ضروری ہے۔

واضح ہو کہ اکرام کا مفہوم انعام کے قریب قریب ہے مگر اکرام خاص ہے اور انعام عام۔ یعنی ہر ایک اکرام انعام ہے مگر ہر ایک انعام اکرام نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جلال وصف تنزیہ پر دلالت کرتا ہے اور اس لئے صرف ذات حقیقی اس کے تحقق کے لئے کافی ہے مگر اکرام وصف اضافی ہے یعنی ایسا وصف جس کا تحقق وجود غیر کو مستلزم ہے یہی وجہ ہے کہ وصف جلال کو ذکر میں مقدم رکھا ہے۔

اسم مالک الملک کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اسم ایسی ذات پر اطلاق کیا جاتا ہے جو اپنی مملکت میں جسب مشیت تصرف کر سکے اور ملک سے مراد مملکت ہے اور موجودات بتمامہا بمنزلہ ایک مملکت کے ہے کہ اشیاء عالم باہم اس طرح مرتبط ہیں جس طرح بدن انسان کے اعضاء سو جس طرح ایک عضو دوسرے عضو کی معاونت کرتا ہے اسی طرح موجودات عالم کا حال ہے۔ اور ان سب کے

تناسب اور ضرورت پر یہ سلسلہ کائنات کا چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس مملکت کا مالک ہے عبد کامل کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی مملکت بدن کے اندرون و بیرون میں بہتر سے بہتر طریق پر تصرف کر سکتا ہے۔

خاصیت

مالک الملک

اس پر مداومت کرے تو مال و تونگری حاصل ہو۔

ذوالجلال والاکرام

اس کے ذکر کرنے سے عزت و بزرگی حاصل ہو۔

دعاء

اللهم مالك الملك توتى الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعزمن تشآ وتذل من تشاء بيدك الخير انك على كل شئى قدير رحمن الدنيا والا خرة تعطيهما من تشآوو تمنع منهما من تشاء ارحمنى رحمة تغننى بها عن رحمة من سواك. (حصن حصين)

اللهم اعظم لى نوراو اعلى نور اواجعل لى نور اسبحان الذى تعطف العز وقال به سبحان الذى لبس المجدو تكرم به سبحان الذى لاينبغى التسبيح الا له سبحان ذى الفضل والنعم سبحان ذى المجد والكرم سبحان ذى الجلال والا كرام. (ترمذى)

الْمُقْسِطُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ اہل زبان بولتے ہیں اقسط فھو مقسط اذا عدل فی الحکم اس لئے اس کے معنے ہوئے وہ ذات جو حکم میں پورا عدل کرے اور قسط بمعنی جار یعنی ظلم کرنا قال اللہ تعالیٰ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَھَنَّمَ حَطَبًا اور قسط بالکسر کے معنے نصیب اور بہرہ کے ہیں۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقسط وہ ذات ہے جو مظلوم کا ظالم سے انصاف لے اور اس وصف کا کمال یہ ہے کہ مظلوم کی رضا مندی میں ظالم کی رضا مندی بھی شامل کر دے اور یہ امر بجز ذات باری عزاسمہ کے کسی مخلوق کا کام نہیں اس کی مثال ایک حدیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام تشریف رکھتے تھے کہ یکایک آپ نے تبسم فرمایا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا بابی انت وامی یا رسول اللہ حضور کے تبسم کی کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمایا کہ میری امت کے دو شخص حضور رب العزت میں حاضر ہوئے ایک نے عرض کیا کہ خدایا! اس شخص سے میرا انصاف لے بارگاہ خداوندی سے

(ظالم) کو حکم ہوا کہ اپنے بھائی کا معاوضہ ظلم واپس کرو اس نے عرض کیا خدایا! میرے نامہ اعمال میں کوئی نیکی باقی نہیں رہی جس سے میں اس کا معاوضہ دے سکوں پھر اللہ تعالیٰ نے مظلوم (داد خواہ) کو فرمایا کہ تمہارے بھائی کے پاس کوئی نیکی نہیں اب تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا خدایا! اگر اس کی کوئی نیکی نہیں تو میرے بار گناہ کو اٹھالے حضور نے یہ فرمایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ یہ وہ احتیاج کا دن ہو گا جس میں ہر ایک شخص یہ چاہے گا کہ کوئی میرے بوجھ کو اٹھالے پھر حضور نے فرمایا کہ احکم الحاکمین مظلوم (داد خواہ) کو کہے گا کہ جنت کی طرف دیکھو جب وہ دیکھے گا تو اسے سونے اور چاندی کے عظیم الشان قصور نظر آئیں گے جن پر نفیس موتی لگے ہوں گے تب وہ سوال کرے گا کہ خدایا یہ عالیشان محل کسی نبی یا صدیق یا شہید کے لئے ہیں ارشاد ہو گا کہ اس شخص کے لئے جو ان کی قیمت ادا کر دے پھر وہ عرض کرے گا کہ خدایا ان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟ حکم ہو گا کہ تم ادا کر سکتے ہو تب وہ شخص عرض کرے گا خدایا کیونکر؟ ارشاد ہو گا کہ اپنے بھائی کے قصوروں کو معاف کر دو یہی ان کی قیمت ہے اس پر وہ شخص عرض کرے گا خدایا! میں نے معاف کر دیا تب وہ ارحم الرحمین اس شخص کو حکم دے گا کہ جاؤ اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حضور علیہ السلام نے اس تقریر عالی کے بعد فرمایا اتقوا اللّٰہ واصلحو اذات بینکم فان اللّٰہ تعالیٰ یصلح بین المومنین یوم القیمۃ یعنی اللہ سے ڈرو اور فیمابین اصلاح کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اھل ایمان باہم میں اصلاح کرے گا۔

مذکورہ بالا مثال سے واضح ہو گیا ہے کہ اس قسم کا انصاف و انتصاف بجز حضرت رب العزت کے کسی مخلوق کی وسعت میں نہیں ہاں عبد کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے نفس سے انصاف لے اور پھر کسی غیر کا کسی غیر سے اور اپنے نفس کا انصاف، کسی غیر سے ہرگز نہ لے بلکہ عفو پر کار بند ہو چنانچہ حضور علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ کبھی آپ نے

باوجود قدرت ذاتی انتقام کسی سے بھی نہیں لیا تھا۔

خاصیت

اس کی مداومت سے عبادت میں وسوسہ نہ آئے۔

الجَامِعُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ اور پھر فرمایا یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ جمع کے معنے لغت میں اکٹھا کرنے کے ہیں اور اس اسم کی توجیہ مختلف طریق پر کی گئی ہے۔

(ا) متماثلات کا جمع کرنا جیسے افراد انسانی کا روئے زمین پر بسانا اور انہیں قیامت کے دن میدان حشر میں اکٹھا کرنا۔

(ب) متبائنات کا جمع کرنا جیسے۔ افلاک' نجوم' ہوا' سمندر' حیوانات' نباتات' معادن وغیرہ کو ایک عالم میں جمع کرنا یا ہڈی' رگوں' پٹھوں' گوشت اور خون کو ایک بدن میں قائم کرنا۔

(ج) متضادات کو جمع کرنا مثلاً حرارت' برودت' رطوبت' یبوست کو یکجا جمع کرنا اور یہ صورت بظاہر نہایت دشوار بلکہ انسانی طاقت سے خارج ہے یا متضاد خواہشات کے دلوں کو ایک غرض مشترکہ پر لے آنا کما قال وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ بہر صورت مذکورہ بالا سب توجیہات صحیح ہیں اور سب کی سب اسم جامع کے مفہوم میں داخل ہیں۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ ظواہر احکام شریعت کے ساتھ حقائق و معارف طریقت کو بھی جمع کر لیتا ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ جامع وہ ذات مقدس ہے جو اپنے اولیاء کے قلوب کو شہود عظمت کے مقام پر پہنچا دیتا ہے اور ملاحظہ اغیار سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

خاصیت

اس کی مداومت سے اپنے مقاصد و احباب سے مجتمع رہے اور جس کی کوئی چیز گم ہو جاوے اس کو پڑھے تو مل جاوے۔

اَلْغَنِیُّ اَلْمُغْنِیُ

جل جلالہ   جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُوالرَّحْمَةِ جو موجود اپنی ذات یا کمال ذات میں کسی طور پر بھی غیر کی طرف محتاج ہو وہ ہرگز غنی نہیں ہو سکتا اور جب غنی نہیں تو اس کا مغنی ہونا ناممکن ہے چونکہ ذات باری واجب الوجود ہے اس لئے وہ کسی جہت سی اپنے ماسوا کا محتاج نہیں لہٰذا وہ غنی ہے اور چونکہ تمام موجودات اور کمالات کا فیضان اس کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے وہ غنی بھی ہے غیر اللہ کے حق میں یہ مقصود نہیں کہ وہ بالکلیت احتیاج سے بری ہو جائے ہاں عبد کامل کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کا مقصد حقیقی بجز ذات باری کے کوئی چیز نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک چیز سے مستغنی ہو سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ سے کبھی کوئی مستغنی نہیں ہو سکتا ایسی حالت میں انسان کو غنی کہہ سکتے ہیں قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اور عبد کامل کا بجز ذات باری کے ہر ایک چیز سے مستغنی ہونا ممکن ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے مغنی ہونے کے کچھ معنے نہیں۔

خاصیت

الغنی

کسی مرض یا بلا کے وقت پڑھے تو جاتا رہے۔

المغنی

ہزار بار پڑھے تو تونگری حاصل ہو اور مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔

المَانِعُ
جل جلالہ

منع کے معنے لغت میں روکنے کے ہیں اور مانع وہ ذات ہے جو دین اور بدن میں ہلاکت و نقصان پیدا کرنے والے اسباب کو رد کرے اور اسباب سے مراد وہ امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سلسلہ حوادث میں خاص مصالح کے لئے پیدا کر دیا ہے اسم حفیظ کی حقیقت اسم مانع کے قریب قریب ہے مگر ان ہر دو میں فرق یہ ہے کہ منع کا مفہوم سبب مہلک کی طرف منسوب ہوتا ہے اور حفظ کا مفہوم محفوظ یا محروس کی طرف کیونکہ وہ مقصود بالمنع ہے اس لئے ہر ایک حفیظ دافع مانع ہوگا مگر ہر ایک مانع حافظ نہیں ہو سکتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ایسے اسباب کا جو موجب نقصان دین یا ہلاک ایمان ہوں نگران رہتا ہے۔

خاصیت

جو اپنی مراد تک نہ پہنچ سکے اس کو صبح و شام پڑھا کرے مراد حاصل ہو۔

الضَّارُّ النَّافِعُ

جل جلالہ - جل جلالہ

یہ ہر دو صفات ذات باری کے کمالات میں داخل ہیں اور ان کا نفی کرنا اس کی ذات کے لئے موجب عیب ہے اور ان ہر دو کو اکٹھا بیان کرنا ضروری ہے جس طرح اسماء مذل و معز کو

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ضار و نافع وہ ذات ہے جس سے خیر و شر اور نفع و ضرر صادر ہو اور یہ امر بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو حاصل نہیں قال اللہ تعالی هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ مگر جو امر قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ نفع و ضرر کے اسباب عالم کائنات میں مختلف ہیں مثلاً ملک' انسان' شیطان اور جمادات فلک' نجوم وغیرہ اور یہ سب اسباب بالواسطہ یا بلاواسطہ ذات باری کی طرف منسوب ہیں اور کوئی چیز ان میں سے بالاستقلال موثر نہیں چنانچہ زہر کی نسبت کبھی یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بذاتہ مضر ہے اور طعام بعینہ موجب سیری ہے بلکہ یہ تمام سلسلہ اسباب زمینی و آسمانی ظاہری و باطنی اس مالک الملک قادر مطلق کی تسخیر و اطاعت میں مضبوط و مستحکم ہے اور یہ ضبط و استحکام اس کی قدرت ازلی کا نتیجہ ہے مگر عام

لوگ اس سلسلہ اسباب کو قدرت ازلی سے اس طرح تعلق دیا کرتے ہیں جس طرح قلم کو کاتب سے یا اگر بادشاہ کسی کاتب کو کسی فرمان انعام یا عقوبت کے لکھنے کا حکم دے تو کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ قلم اس انعام یا عقوبت کا حقیقی سبب ہے اور نہ کاتب کو بلکہ بادشاہ کی ذات پر پہنچ کر عوام الناس رہ جائیں گے مگر ایک صاحب بصیرت جو ارادہ کو مظاہر کائنات میں موثر دیکھ رہا ہے وہ قلم اور کاتب اور بادشاہ کو ذات باری عزاسمہ کے ارادہ و قدرت کی تسخیر و اطاعت سے وابستہ دیکھتا ہے کیونکہ یہ درمیانی وسائط بطور قانون طبعی (لفظ قانون طبعی سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب کاتب اور قدرت کتابت اور ارادہ کتابت اور عزم صادق مجتمع ہو جائیں اور ارادہ ازلی دوبارہ کتابت جاری ہو چکا ہو تو کچھ شک نہیں کہ فعل کتابت واقع ہو کر رہے گا) کے سب اسی ذات کی' مخلوق و مقسور ہیں اس تقریر سے صاف معلوم ہو گیا کہ حقیقی طور پر ضار اور نافع وہی ذات حقیقی ہے۔

ذات باری کا ضار و نافع ہونا دینی و دنیوی حالات میں یکساں طور پر جاری ہے مثلاً ہدایت و ضلالت اور غنا و فقر اور صحت و مرض وغیرہ کے اسباب برابر مظاہر عالم میں عمل کر رہے ہیں چنانچہ اہل بصیرت کو خوب معلوم ہے کہ یہ اسباب بتمامہا ارادہ ذات باری کے ماتحت جاری ہیں پس صحیح الایمان آدمی ہمیشہ حوادث کو براہ راست ذات باری کی طرف منسوب کرتا ہے اور وسائط کو نظر انداز کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص کبھی نزول حوادث پر جزع و فزع نہیں کرتا برخلاف جاہل اور بد اعتقاد آدمی کے کہ وہ اسباب کو علت موثرہ سمجھ کر رجوع الی اللہ نہیں کرتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اعداء اللہ کے حق میں ضار اور اولیاء اللہ کے حق میں نافع ثابت ہوتا ہے قال اللہ تعالیٰ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ اور پھر فرمایا اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ مگر ایسے عبد کامل کا شدت حق کفار اور رحمت حق ابرار برتنا محض

اللہ تعالیٰ کی رضا پر مبنی ہوتا ہے نہ اس کی خواہش نفس پر اور نیز ایسا شخص نہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے ڈرتا ہے اور نہ کسی سے امیدوار ہوتا ہے بلکہ ہر حالت میں اس کا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں یہ کلمات لکھے تھے انا اللّٰہ الذی لا الہ الا انا من لم یستسلم لقضائی ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر لنعمائی فلیطلب ربا سوائی یعنی میں خدائے وحدہ لاشریک ہوں جو شخص میرے حکم ازلی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا اور میری بھیجی ہوئی مصیبت پر صابر نہیں ہوتا اور میری دی ہوئی نعمت کا شکر نہیں کرتا اسے چاہیے کہ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو اپنا پروردگار بنالے۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں درد دندان کی شکایت کی حکم ہوا کہ فلاں بوٹی کا استعمال کرو چنانچہ آپ نے اس بوٹی کو استعمال کیا اور درد فی الفور بند ہو گیا پھر کچھ مدت کے بعد دوبارہ درد نے عود کیا اور آپ نے اس بوٹی کا استعمال کیا مگر درد نہ رکا آپ نے جناب رب العالمین میں عرض کیا کہ خدایا تو نے مجھے فلاں بوٹی کے استعمال کا حکم دیا تھا مگر درد بند نہیں ہوا جواب ملا کہ شفاء عافیت اور ضرر و نفع ہمارے ہاتھ میں ہے کوئی چیز ہمارے حکم کے بغیر نہ ضرر دے سکتی ہے نہ نفع۔ پہلی دفعہ تم نے ہماری طرف رجوع کیا تھا ہم نے تمہاری تکلیف کو دفع کر دیا دوسری دفعہ تم نے بوٹی کو ازالہ مرض کا سبب سمجھا اور ہمیں چھوڑ دیا۔

حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ ضار وہ ذات ہے جو کفار پر ارادہ ازلی کے مطابق ضرر عائد کرے اور ابرار کو مشیت ازلی کے مطابق نفع پہنچائے بعض لکھتے ہیں کہ ضار وہ ذات ہے جو اہل عصیان کو محروم رکھے اور نافع وہ ذات ہے جو اہل اطاعت کو مورد احسان بنائے ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ تین امور منجملہ اعمال رضا شمار ہوتے ہیں قبل جریان قضاء ترک اختیار اور بعد جریان قضاء عدم کراہت اور نزول بلا پر ترقی محبت۔

خاصیت

الضار

شب جمعہ میں سوبار پڑھے ضرر سے محفوظ رہے۔

النافع

جس چیز سے نفع حاصل کرنا ہو اس کو دل سے پڑھے

النُّوْرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عام طور پر نور اس کیفیت سے مراد ہے جو ضد ظلمت ہے مگر اس معنی کی رو سے ذات باری پر اس اسم کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کیفیت حادث ہے جو موجود ہو کر زائل ہو جاتی ہے اور ذات باری حدوث سے بری ہے مع ہذا یہ کیفیت قائم بالجسم ہوتی ہے اور قیام بالغیر منافی وجوب ہے اور ذات باری واجب الوجود ہے نیز یہ کیفیت بالنسبۃ الی الظلمۃ ایک امر اضافی ہے اور ذات باری اضافت سے پاک ہے۔

مسطورہ بالا آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے مختلف اقوال قلمبند کئے ہیں مثلاً

(ا) نور وہ حقیقت ہے جس پر تمام اشیاء مخفیہ ظاہر ہوں اور خفاء فی الحقیقت عدم کا نام ہے اور ظہور وجود کو بولتے ہیں اور ذات باری موجود ہے جس پر عدم کا عائد ہونا محال ہے اور چونکہ ذات باری تمام موجودات کی خالق ہے اس لئے وہی ہر ایک ظلمت ظہور کا نور بلکہ نور الانوار ہے۔

(ب) نور سے مراد منور (روشن کنندہ) ہے۔

(ج) لفظ نور سے بعض اوقات ایسے سبب سے مراد لیا کرتے ہیں جو نظم مصالح اور اصلاح امور کا باعث ہو چنانچہ یوں کہہ سکتے ہیں فلاں نور البلدۃ یعنی اس کی ذات سے انتظام مصالح وابستہ ہے اس لئے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ سلسلہ انتظام کائنات کا قائم رکھنے والا ہے۔

لیکن اس اسم کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ نور وجود کا مترادف ہے یہ مستلزم ظہور ہے اور وجود تمام اشیاء کا ذات باری سے ظاہر ہوا جس طرح نور آفتاب کا ایک ذرہ وجود آفتاب پر دلیل ہے اسی طرح ایک ایک ذرہ کائنات کا اپنے موجد حقیقی کے وجود کا شاہد ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کو معرفت الٰہی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور یہ معرفت ایک نور ہے جو قلب مومن میں پیدا ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ نور وہ ذات ہے جو اہل صدق کے قلوب کو نور توحید سے اور اہل محبت کے باطن کو تائید ازلی سے بھر دیتا ہے اور بعض لکھتے ہیں کہ نور وہ ذات ہے جو قلوب عارفین کو نور معرفت سے اور نفوس عابدین کو نور عبادت سے زندہ کرتی ہے۔

خاصیت اس کے ذکر سے نور قلب حاصل ہو۔

دعاء اللھم لك الحمد انت نور السموات والارض ولك الحمد انت قیام السموات والارض ولك الحمد انت رب السموات والارض ومن فیھن انت الحق و وعدك الحق ولقاء ك حق والجنۃ حق والنار حق والساعۃ حق اللھم لك اسلمت وبك امنت وعلیك توكلت والیك انبت وبك خاصمت والیك حاكمت فاغفرلی ماقد مت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت الھی لا الہ الا انت. (ترمذی)

الھَادِیُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالی لَہَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اسم ہادی مشتق ہے مصدر ہدایت سے جس کے معنے رہنمائی کے ہیں اور ہدایت کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے۔ (ا) کسی کو راستہ دکھلا دینا (ب) کسی کو مطلوب تک پہنچا دینا اور قرآن مجید میں انہیں ہر دو معنے میں اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

ذات باری کا ہادی ہونا مختلف طریق پر اعتبار کیا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ وہ اپنے بعض بندگان کو اپنی معرفت اور نور توحید سے خصوصیت بخشتا ہے کما قال وَيَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ نیز ہر ایک مخلوق کو ایک فطرت لائقہ پر پیدا کر کے اس کو جلب منفعت اور دفع مضرت کی ہدایت کرتا ہے کما قال رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى مع ہذا اس کا ہادی ہونا یوں بھی صحیح ہے کہ وہ اپنے کلام سے جو انبیاء پر نازل فرماتا ہے بندوں پر طریق حق واضح کرتا ہے اور دلائل حقہ پر آگاہ کرتا ہے۔

نوع انسان میں سے وہ لوگ ہادی ہو سکتے ہیں جو عوام الناس کو سعادت اخروی کی طرف دعوت کریں اور انہیں صراط مستقیم پر چلائیں اور وہ بزرگ گروہ

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہے اور ان کے بعد علمائے راسخون فی العلم کا جو ورثۃ الانبیاء کہلاتے ہیں اور در حقیقت اس صورت میں بھی ذات باری ہی ہادی ہے کیونکہ انبیاء و علماء بھی اللہ تعالیٰ کے حکم و ارادہ کے زیر تسخیر ہوتے ہیں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ ہادی وہ ذات ہے جو قلوب کو اپنی معرفت اور نفوس کو اپنی اطاعت کی راہ دکھائے اور بعض لکھتے ہیں کہ ہادی وہ ذات ہے جو اہل معصیت کو توبہ اور اہل معرفت کو حقیقت قرب کی ہدایت کرتا ہے۔

خاصیت

اس کے ذکر سے یا لکھ کر پاس رکھنے سے بصیرت اور فہم صحیح پیدا ہو۔ اہل حکومت کے لئے بھی مناسب ہے۔

البدیعُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس اسم کی تفسیر دو طرح پر کی گئی ہے اول تو یہ کہ بدیع وہ ذات ہے جس کی نظیر یا مثل موجود نہ ہو چنانچہ کسی عدیم النظیر چیز کی نسبت بول دیا کرتے ہیں ھذا شئی بدیع سو جب کسی ممکن چیز کی نسبت اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے تو ذات باری کی نسبت بدرجہ اولیٰ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے کیونکہ ازل سے ابد تک اس کی نظیر یا شبیہ کا وجود ممتنع ہے دوم یہ کہ بدیع بمعنی مبدع ہے یعنی فعیل بمعنی مفعل مگر بدع فعل ثلاثی کی تصریف اہل زبان کے ہاں مستعمل نہیں ہوئی اس صورت میں بدیع وہ ذات ہو گی جو مخلوقات کو ابتداء بلا سابقہ مثال کی تقلید کے پیدا کرے کوئی توجیہ ہو یہ اسم مطلقاً بجز ذات باری کے کسی مخلوق پر اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہاں عبد کامل جو صفات نبوت یا ولائت یا علم میں کسی خصوصیت کے لحاظ سے بے نظیر ہو وہ مجازاً اس اسم کا مصداق ہو سکتا ہے خواہ اس کا بے نظیر ہونا جمیع ازمنہ ثلاثہ میں ہو یا صرف اس کے اپنے زمانہ میں۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ بدیع وہ ذات ہے جو عجائب صفت اور غرائب حکمت کو ظاہر کر سکے۔

خاصیت

اس کو ہزار بار پڑھے تو حاجت پوری ہو اور ضرر دفع ہو۔

الْبَاقِیُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَاللّٰہُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ذات باری واجب الوجود ہے اس لئے اس کا وجود ازلی و ابدی ہے جب اس کے وجود کو ازل کی طرف نسبت کرتے ہیں تو قدیم اور جب ابد کی طرف منسوب کریں تو اسے باقی کہتے ہیں اور واجب الوجود ہر دو جہت نسبت پر حاوی ہے اس نسبت ماضی و مستقبل سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ ذات باری کا جریان ہو سکتا ہے کیونکہ زمانہ صرف حادث شے پر جاری ہوتا ہے جس پر تغیر و انقلاب کا عارض ہونا ممکن ہے اور ذات باری تغیر و انقلاب سے بری ہے بلکہ وہ قبل از زمان اور بعد از زمان یکساں حالت پر قائم ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بقاء ذات باری اس کی ذات سے کوئی زائد وصف نہیں ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو کیونکہ اس صورت میں دور و تسلسل لازم آتے ہیں جو باطل ہیں۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ باقی وہ ذات ہے جو اول بلا ابتداء اور آخر بلا انتہا ہو محقق نصر آبادی لکھتے ہیں کہ ذات حق اپنی ذاتی بقاء کے ساتھ اور جمیع مخلوقات اس کے فیض بقاء کے ساتھ قائم ہے انسان کامل جب لوازم بشریت

سے علیحدہ ہو کر منازل سلوک کو پورا کر لیتا ہے تو وہ بقائے دوام کا رتبہ پا لیتا ہے اور حیوۃ طیبہ کا مالک ہو جاتا ہے اس صورت میں اس کے ہیکل عنصری کیساتھ موجود رہنے اور اس کو ترک کر دینے میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ قال اللّٰہ تعالیٰ فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ

خاصیت

ہزار بار پڑھے تو ضرور غم سے خلاصی ہو۔

اَلْوَارِثُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ اور پھر فرمایا وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ اہل بصیرت جو حقیقت توحید سے آگاہ ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ ملک وملکوت کا ایک ایک ذرہ اس وحدہ لاشریک کے قبضہ قدرت میں قائم ہے اور ایک لحظہ بھر کے لئے اس کے اقتدار و تصرف سے خارج نہیں ہو سکتا ہاں اس نے انتظام عالم کے قائم رکھنے کے لئے محض اپنے فضل و کرم سے عارضی طور پر اپنے بندوں کو بعض اشیاء کا مالک بنا رکھا ہے مگر جب وعدہ ازلی کے مطابق سلسلہ عالم کا خاتمہ ہو جائے گا اور عارضی مالک و مملوک کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا تو حقیقت توحید کے اثبات و اظہار کے لئے وہی مالک حقیقی ندا کرے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ چونکہ بجز اس کی ذات کے تمام نسبتیں مالکیت و مملوکیت کی منقطع ہو جائیں گی خود ہی جواب دیں گے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ذات باری کے اس سوال و جواب کی حقیقت اہل توحید پر آج ہی منکشف ہے کیونکہ وہ عالم کو وصف فنا کے ساتھ متصف دیکھتے ہیں اور بقاء ذات باری اور اس کی حقیقت مالکیت کو اسی طرح مشاہدہ کر رہے ہیں جس طرح اہل

ظاہر قیامت کے دن کھلم کھلا مشاہدہ کریں گے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ وارث وہ ذات ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے صاحب وارث نہ ہو بلکہ ذاتی طور پر صاحب تصرف و اختیار ہو بعض لکھتے ہیں کہ وارث وہ ذات ہے جس نے بے نیازی کا جامہ پہنا ہو اور اپنی حقیقی وحدت میں یگانہ ہو۔

انسان کامل جب اسرار معرفت پر حاوی ہو جاتا ہے تو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم کا وارث بن جاتا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء کے یہی صحیح معنے ہیں اور جب حضرات انبیاء علیہم السلام کے مدارج علوم پر ترقی کرتا ہے تو بحکم تخلقوابا خلاق اللہ وہ اسم وارث کا مظہر کامل بن جاتا ہے۔

خاصیت

درمیان مغرب و عشاء کے ہزار بار پڑھے تو حیرت دفع ہو۔

اَلرَّشِیْدُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا۔ رشد مصدر سے مشتق ہے جو غی (ضلالت) کی ضد ہے اور جس کے معنے استقامت کے ہیں۔ اس کی توجیہ دو طرح پر ہو سکتی ہے اول تو یہ کہ رشید بمعنی راشد ہے جس کے معنے حکیم کے ہیں یعنی ایسی ذات جس کے افعال میں عبث و باطل کو دخل نہیں دوم فعیل بمعنی مفعل یعنی رشید بمعنی مرشد اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ رشید وہ ذات ہے جو ہر ایک مخلوق کو اس کی فطرت کے مطابق اس کی مصلحت کی طرف ہدایت کرے۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کی تدبیرات بلا کسی مشیر کے عین صواب ہوں اور یہ امر بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں بعض لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کو چاہے سعید بنادے یا شقی بنادے اور بعض لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کی تدبیر میں سہو اور تقدیر میں لہو کو کچھ دخل نہ ہو۔

انسان کامل کا رشید ہونا اسی قدر زیادہ صحیح ہو گا جس قدر وہ اپنے دینی و

دنیوی مقاصد میں عین ہدایت پر کاربند ہو

خاصیت

بعد نماز عشاء کے سوبار پڑھے تو عمل مقبول ہو۔

الصَّبُورُ

جل جلالہ

یہ اسم بھی قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا صبر مصدر سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں اور اس کا مفہوم قریب قریب اسم حلیم کے ہے مگر حلیم میں امن از عقوبت کا مفہوم زیادہ قوی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جو قبل از وقت فعل کے بجا لانے میں جلدی نہ کرے۔ بلکہ قانون ضروری کے مطابق ایسے وقت معلوم پر ملتوی رکھے جو غفلت و کسل کی آمیزش سے بالکل پاک ہو مگر یہ التواء ایسا نہ ہو جس کے ساتھ مخالف جانب کی کشش بھی لگی ہو کیونکہ یہ صورت انسانی صبر کی ہے جس میں داعیہ نفس انسان کو جلد بازی پر ابھارتا ہے اور وہ نفس کا مقابلہ کر کے جانب مخالف سے باز رہتا ہے اور انسان اس وقت وصف صبر سے متصف ہوتا ہے جبکہ داعیہ نفس کو مغلوب و مقہور کر سکے مگر یہ بات بجز مجاہدہ نفس کے حاصل نہیں ہو سکتی صبر کے مختلف مراتب ہیں ابتداء میں مقابلہ نفس کرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے مگر بتدریج یہ بات آسان ہو جاتی ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جس کو بندہ کی کثرت معصیت کثرت عقوبت پر آمادہ نہ کرے اور بعض لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جو جفاء کا مقابلہ عطاء اور عصیان کا مقابلہ غفران کے ساتھ کرے۔

ابوبکر وراق رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ اپنے اور بندوں کے درمیان صدق اور اپنے اور نفس کے درمیان صبر کے ساتھ استقامت کرو اور اسی امر کو نجات اخروی کا مدار سمجھو۔ فقط

خاصیت

آفتاب طلوع ہونے سے پہلے سو بار پڑھا کرے تو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور کتابوں میں اور بھی بے شمار خواص مذکور ہیں مگر اخلاص و اعتقاد کے ساتھ اس قدر بھی کافی ہے۔

ھذا اخر کلامنافی مبحث الاسماء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توحید ذات باری کی حقیقت کا سمجھنا اسماء و صفات کے معانی کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ قرآن مجید میں جن اسماء و صفات کا ذکر آیا ہے وہ سب کے سب علیحدہ علیحدہ مختلف مسائل علم عقائد کے لئے بمنزلہ اصل اصول کے ہیں۔ سلف صالحین ان اسماء و صفات کے معانی کو خوب سمجھتے اور اس لئے انہیں علیحدہ علم عقائد کی تعلیم کی ضرورت نہ پڑتی اسلام میں جس قدر عقائد تسلیم کئے گئے ہیں ان کا منبع یہی اسماء و صفات ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک اسماء و صفات کا علم نہ ہو۔ کوئی شخص عقائد صحیحہ حاصل نہیں کر سکتا اور نہ معانی آیات کے سمجھنے کی اس کو قدرت ہو سکتی ہے چونکہ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اور حقائق علمیہ کے سمجھنے پر محنت اور وقت کا صرف کرنا دشوار ہو گیا ہے لہذا خاکسار نے برادران اسلام کی دینی خدمت کو مد نظر رکھ کر بطور اختصار اسماء و صفات ذات باری کی یہ شرح لکھی ہے تاکہ انہیں بہت سے مذہبی مسائل مشکلہ کے حل کرنے میں مفید ثابت ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسماء و صفات کی علمی تحقیق کو لفظوں میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ حقائق جن کا انکشاف تصفیہ و تزکیہ باطن پر موقوف ہے اور جو محض وجدان سلیم اور ذوق صحیح سے حاصل ہوتے ہیں بذریعہ الفاظ ظاہر کئے جائیں کیونکہ یہ بات صرف صاحب مقام ہونے پر منحصر ہے اور صاحب مقام لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ ہی ہو سکتا ہے ہر ایک ہوسناک کو یہ پایہ نصیب نہیں ہوتا۔

اگر ژالہ ہر قطرہ درشدے   چو خر مہرہ بازار ہا پر شدے

ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ اگر کسی سعادت مند کو توفیق ازلی یاور ہو۔ اور روش صالحین کی محبت اس کے دل میں جاگزین ہو جائے تو شوق طلب اس کو انہیں حضرات کے ساتھ وابستہ کر دے۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست در پائے کبوتر زدو ناگاہ رسید

حق یہ ہے کہ محبت صالحین انسان کو صالح بنا دیتی ہے کیونکہ بموجب فرمان حضرت نبویؐ المرء مع من احب قیامت کے دن انہیں لوگوں کے زمرہ میں مبعوث ہو گا۔ جن کی محبت اور جن کے طریق کو وہ پسند رکھتا ہے۔ یہ بھی ہو نہیں سکتا کہ اہل سعادت کا دامن پکڑ کر کوئی شخص منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے ہاں حسن ارادت شرط ہے کیونکہ بے طلب صادق کبھی کچھ نہیں ملا کرتا۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

اس حسن ارادت کے ساتھ حسن ادب بھی شرط ہے کیونکہ بے ادب آدمی جو سوء ظن کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے ہمیشہ محروم رہا کرتا ہے کماقلت فی ذالك

ادب گزیں کہ نہ بخشد لقمہ زیں خواں
بسائلے کہ نشیند بر آستان گستاخ

مجھے یہ خیال تھا کہ میں اس موضوع پر کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کروں گا مگر بعد میں بوجوہ چند ایجاز و اختصار کو مد نظر رکھنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ عام طبائع مباحث دقیقہ سے مستفید نہیں ہوتیں جہاں کوئی مشکل بحث شروع ہو گئی کتاب کو بند کیا اور وہیں کی وہیں طاق نسیان میں پڑی رہی۔

عربی میں اسماء و صفات ذات باری پر بہت سی کتب و رسائل موجود ہیں۔ ہر ایک کا طرز بیان جدا ہے۔ اور کسی نہ کسی پہلو میں مفید مگر میری نظر سے جس قدر کتابیں اس موضوع کی گذری ہیں۔ ان میں سے حضرت امام حجتہ الاسلام محمد غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب المقصد الاسنے اور فخر المتکلمین امام رازی علیہ الرحمتہ کی کتاب لوامع البینات زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ لہذا انہیں کو اس رسالہ کا ماخذ تصور کرنا چاہیے۔ اگرچہ دو تین اور کتابیں بھی لکھتے وقت میری زیر نظر تھیں ان ہر دو بزرگوار کی تصانیف سے جدا جدا ان کے اپنے مقامات قلب کا پایہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان ہر دو کتب سے بھی صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ

حضرت غزالی بحر عرفان میں مستغرق ہیں اور امام رازی عقلیات کے میدان میں چل رہے ہیں اگرچہ کہیں کہیں اصحاب ذوق و وجدان کی روش بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ یہ مقام حضرت غزالی ہی کا ہے۔ رازی بیشک علوم میں بڑا پایہ رکھتے ہیں مگر غزالی میدان ریاضت و مجاہدت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ لہذا ان کا کلام ایک خالص صاحب حال کا کلام ہے۔ رازی جا بجا ان کی کتاب مذکور کا حوالہ دیتے ہیں اور امام صاحب کا نام نہایت معزز الفاظ میں لیتے ہیں فرحمہما اللہ تعالیٰ شرح اسماء و صفات سے پہلے چند ایسے مسائل کا قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا سمجھنا اس رسالہ کے مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ وما انا اشرع فی المقصود متوکلاً علی الرب المعبودھو حسبی و نعم الوکیل

اسماء وصفات منبع جمیع عقائد حقہ ہیں

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اسماء و صفات جمیع عقائد اسلامیہ کا منبع ہیں لہذا اہل السنت والجماعۃ کثرہم اللہ تعالیٰ مسئلہ اسماء و صفات کو معرفت ذات باری کا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور کبھی مسلک اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے بر خلاف دیگر اسلامی بدعتی فرقوں کے جن کا مدار عقائد علوم عقلیہ پر ہے۔ اور کتاب و سنت میں تاویلات باطلہ کر کے اپنے مسلمات کو ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ عزت دینی اور راحت دنیوی دینا چاہتا ہے اور اپنی معرفت کی طرف بلاتا ہے تو اس کا سینہ قبول حق کے لئے کھول دیا جاتا ہے اور انوار نبوت سے تمام معتقدات حقہ کو حاصل کرتا ہے یہی امر نشان سعادت ہے اور یہی عافیت دارین کا موجب ہوتا ہے۔

ایں نعمت بیدلی بہر دل ند ہند
ویں نزل محققاں منزل ند ہند
در عالم عشق آنچہ بے عقلاں راست

یک ذرہ بصد ہزار عاقل ند ہند

اہل حق مسئلہ صفات میں جو علم عقائد میں نہایت دقیق مسئلہ ہے ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ اور صفات ذات باری کو جو کتاب و سنت میں وارد ہو چکی ہے تعریفات وحی کی سمجھتے رہے ہیں اور اس اصل عظیم کو شفاء روحانی کا واسطہ سمجھ کر مورد تجلیات ہوتے رہے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی علم کا شریف ہونا اس علم کی غایت کے شریف ہونے پر مبنی ہے چونکہ اسماء و صفات کا علم حصول معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے لہذا اس علم سے بڑھ کر اور کوئی علم ضروری نہیں ہو سکتا کیونکہ معرفت ذات باری بقدر حوصلہ بشری ہر ایک انسان کا فرض ہے مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِہٖ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی جس قدر جسم انسانی کو غذا کی ضرورت ہے اس سے بڑھ کر روح کو ان معارف حقہ کی ضرورت ہے جو بمنزلہ غذاء روح ہیں جو شخص معارف حقہ سے بے بہرہ اور ذوق سلیم سے بے نصیب ہے وہ عارفان خدا کی اصطلاح میں مردہ ہے۔ وفی الجهل قبل الموت موت لاهله اس لئے جس قدر کسی شخص کو اسماء و صفات کا زیادہ علم ہو گا اسی قدر معرفت ذات باری میں زیادہ ممتاز ہو گا اور جس قدر زیادہ معرفت کا مالک ہو گا اسی قدر زیادہ مقرب حضرت باری ہو گا اور جس قدر کوئی شخص حقیقت اسماء و صفات سے جاہل ہو گا اسی قدر لذت ذکر سے ناآشناء ہو گا بلکہ اسے نفرت و کراہت ہو گی یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی ذکر مسنون ایسا نہیں جس میں اسماء و صفات نہ آئے ہوں پس لذت ذکر کے کامل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسماء و صفات کے معانی حقیقیہ کا علم حاصل کیا جائے کیونکہ اسماء و صفات بمنزلہ تعریف کے ہیں (تعریف سے یہاں منطقی اصطلاح مراد نہیں ہے بلکہ لغوی مفہوم مراد ہے) اور تعریف ذات باری سے عظمت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور عظمت سے محبت اور محبت تمام ترقیات کے لئے اصل عظیم ہے جب ذکر اس طریق سے کیا جاتا ہے تو کثرت ذکر ذاکر کو انواع و اقسام کی تجلیات کا مورد بنا دیتی ہے اور پھر کبھی غفلت نہیں ہوتی بلکہ دوام ذکر کا رتبہ جو تعلیم وحی کا مقصد اعلیٰ ہے حاصل ہو

جاتا ہے اور قلب کو بے اختیارانہ محبت کا مقام نصیب ہوتا ہے کما قیل۔

واذا تقاضیت الفواد تناسیاً الفیت احشائی بذاک شحاحاً

جب میں اپنے دل سے اس کی یاد بھلا دینا چاہتا ہوں تو وہ اس بارے میں بخیل ثابت ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ عقائد میں رائے زنی کا ہر ایک شخص مدعی ہے۔ اور کتاب و سنت کو بالائے طاق رکھ کر ملاحدہ فلاسفہ کی پیروی کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور عقائد دین پر نکتہ چینی کرنے کو کمال علمی تصور کرتا ہے اس لئے ہر ایک خالص الایمان کو اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عقائد صحیحہ کو کتاب و سنت سے اخذ کرے۔ مسلک اہل السنت سے سر مو تجاوز نہ کرے اور مسئلہ صفات میں بڑی احتیاط سے کام لے کیونکہ جس قدر الحادوز ندقہ آج تک اسلامی فرقوں میں پھیلا ہے۔ صرف مسئلہ صفات میں بے لگامی کا نتیجہ ہے آج کل نیچریت اور دہریت کی گرم بازاری ہے اور یہ الحاد صرف مسئلہ صفات میں بے اعتدالی کرنے کا نتیجہ ہے عام طور پر مغربی تعلیم کے لوگ اس الحاد میں مبتلا ہیں اور انکار معجزات اور انکار وحی انکار ملائکہ اور انکار حشر اجساد جو عقائد اسلام میں مہتم بالشان عقائد ہیں۔ ان کا معمولی دستور ہے ان لوگوں کے عقائد اوہام فلسفہ کے زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں کتاب و سنت سے ایک گونہ نفرت آتی ہے ہاں بعض لوگ خوف بدنامی کھلم کھلا اپنے عقائد فاسدہ کا اظہار نہیں کرتے مگر دل میں انہیں اس قدر وساوس و شکوک پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی۔

بعض عارفین (ابو علی رودباری قدس سرہ) نے اسماء ذات باری کی نسبت لکھا ہے اظہر الحق الاسامی وابدھا للخلق لیسکن بھاقلوب المحبین ویونس بھا قلوب العارفین لہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے اسماء شریفہ کا اظہار فرمایا ہے تاکہ اس کے عاشق اور عارف لوگوں کے قلوب سکون اور انس حاصل کر سکیں۔ انتہی در حقیقت اسماء و صفات ترقی

معرفت کا ذریعہ ہیں سالک جب صاحب ذکر ہو کر استقلال و استقامت کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو انہیں اسماء و صفات کی حقیقت کا انکشاف شروع ہو جاتا ہے جو اصطلاح فن تصوف میں تجلی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح کلام الٰہی سے ماخوذ ہے فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ علمی طور پر اسماء و صفات کا علم ہو چکنے کے بعد جب سالک کو استقامت حاصل ہو جاتی ہے تو کیفیت حالیہ بذریعہ تجلیات وارد ہوتی ہے جس سے مقام یقین میں بتدریج ترقی ہونے لگتی ہے اس مقام میں معتقدات سالک وساوس و شکوک سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور اس تعلق کی حقیقت کھل جاتی ہے جو بظاہر موجودات کے ساتھ اسماء و صفات ذات باری کو حاصل ہے یہی حقیقی عرفان ہے اور اس شخص کو عارف الٰہی کہتے ہیں جو اس تعلق کی کیفیت پر آگاہ ہوتا ہے اس مقام پر عارف کو تمام موجودات زمینی و آسمانی ارادہ الٰہی اور مشیت ازلی کی مغلوب و مقہور معلوم ہوتی ہے اور وہ نور معرفت سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ کس طرح پر صفات باری حوادث کی علت ہیں اور کیونکر ایک زبردست ارادہ تمام ذرات کائنات پر محیط ہے۔ اس مقام پر رابطہ محبت الٰہی مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے اور محب کو عاشق صادق کہلانے کا حق حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کے حضور سے ایک آن کے لئے بھی علیحدگی پسند نہیں کرتا بلکہ تمام مصائب و تکالیف کو جو عالم طبیعت میں اس پر عائد ہوتی ہیں بمقابلہ وصل محبوب کے آسان سمجھ لیتا ہے یا ان کا اسے احساس ہی نہیں ہوتا اس وقت اس کی حالت ان اشعار کا مصداق ہو جاتی ہے۔

اراك فیمتلی قلبی سروراً
واخشی ان تشط بك الدیار
فجرو اھجرو صدلا تصلنی
رضیت بان تجور وانت جار

ترجمہ۔ میں تجھے دیکھتا ہوں تو باغ باغ ہو جاتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں تو مجھ سے دور چلا جائے ظلم ہجر اعراض جو تیرا دل چاہے مجھے منظور ہے ہاں مگر مجھ

سے دور نہ ہو۔

بحث اسم و مسمےٰ

علم کلام میں یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ آیا اسم و مسمی ایک ہی حقیقت کا نام ہے یا دونوں مختلف الماہیتہ ہیں جمہور اشاعرہ کا مذہب ہے کہ اسم و مسمے ہر دو ایک ہی حقیقت ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں مگر معتزلہ اس امر کے قائل ہیں کہ اسم و مسمے دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں امام غزالی قدس سرہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ اسم و مسمے ایک نہیں اسی مذہب کو امام رازی نے اختیار کیا ہے ابن حزم ظاہری کا مسلک بھی یہی ہے اور فی الحقیقت یہی صحیح بھی ہے جو لوگ اسم و مسمی کو حقیقت واحدہ بتلاتے ہیں وہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ یہاں اسم کا متبارک ہونا آیا ہے اور متبارک ہونا مسمی کی شان ہوتی ہے نہ اسم کی لہذا اسم و مسمے ایک ہی ہیں پھر دوسری جگہ فرمایا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى اس آیت سے اسم کی تسبیح ظاہر ہوتی ہے حالانکہ تسبیح ذات باری کی ہوا کرتی ہے لہذا اسم و مسمی کو جب تک ایک نہ مانا جاوے معنی صحیح نہیں ہو سکتے اسی قسم کی بعض اور آیات سے بھی تمسک کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے ہرگز اسم و مسمی کا ایک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اسم واسطہ ذکر ہے جس کے ذریعہ ذات باری کی تنزیہ کی جاتی ہے چونکہ ہر دور میں غایت تعلق ہے اس لئے تنزیہ ذات اور تنزیہ اسم میں کوئی فرق نہیں یہی جواب پہلی آیت کا ہے کیونکہ ذات باری کا اسم بھی موجب خیرات و برکات ہے اس لئے اسم کا متبارک ہونا بالکل صحیح ہے یہ بدیہی امر ہے کہ اسم ایک لفظ ہے جو بذریعہ صوت منہ سے نکالا جاتا ہے اور مسمے ذات کا نام ہے لفظ نار اور وہ چیز جو روشن ہوتی اور جلاتی ہے اگر ایک ہی ہوں تو چاہیے کہ نار کا لفظ بولتے وقت زبان جل جایا کرے۔ مع ھذا اسم و مسمے کے صفات کا علیحدہ علیحدہ ہونا خود اس امر کی پختہ شہادت ہے کہ ہر دو متحد الحقیقت نہیں ہو سکتے مثلاً سیاہ یا

سفید ہونا کسی چیز کی صفت تو ہو سکتا ہے مگر اسم کی جو ایک لفظ ہے ہرگز صفت نہیں ہو سکتا ہاں بعض موقع پر یہ ضروری ہے کہ اسم و مسمی ایک ہی ہوں مثلاً خود لفظ اسم کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسم ہے نہ فعل و حرف اسم و مسمی کے متحد الحقیقت ہونے پر بعض لوگ لبید کے قول ذیل سے استشہاد کیا کرتے ہیں حیث قال۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکما

اس مصرع میں اگر اسم کو عین سلام نہ کہا جائے تو کوئی معنے نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ لبید رضی اللہ عنہ صحابی تھے انہوں نے اپنے کلام میں ہرگز ایسا خیال ظاہر نہیں کیا جو کئی ایک مفاسد کا مستلزم ہو اس مصرع میں سلام یا تو منجملہ اسماء ذات باری کے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم سلام تمہارا حافظ ہو اور یا سلام سے تحیت مراد ہے سو اس صورت میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ تحیت کا واقع کرنا کسی تحیت کہنے والا کا کام نہیں بلکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے لبید صرف اسم تحیت کہنے کی قدرت رکھتے تھے لہذا قرآن مجید میں صاف وارد ہے وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسماء ذات باری نہیں ہو سکتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ذات باری ایک ہی ہے اور اسماء متعدد ہیں چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے ان للہ تسعة وتسعین اسماً مائة غیر واحد کیا کوئی اہل توحید اس امر کو جائز رکھے گا کہ ذات باری ننانوے ہیں معاذ اللہ یہ تو صریح کفر ہے۔ ہم نے اس بحث کو زیادہ طول نہیں دیا کیونکہ اس میں کوئی خاص مفید بات نظر نہیں آئی امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے اس بحث کو کسی قدر طول کے ساتھ لکھا ہے۔ فمن شاء فلیرجع الیہ

اسماء و صفات میں فرق

اسم کی تعریف نحوی ہمارے موجودہ مبحث سے خارج ہے ہمیں یہاں

اسم کے مفہوم عام سے حث کرنا مد نظر ہے اس مفہوم کے رو سے اسم و فعل و حرف سب اسماء میں داخل ہیں کیونکہ اسم کا مفہوم عام صرف یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کا پتہ دیتا ہو خواہ وہ حقیقت مستقلہ ہو یا غیر مستقلہ اس صورت میں اگر وہ حقیقت صرف ایک چیز کے مفہوم تک محدود ہو تو وہ اسم ہے مثلاً سماء ارض جدار وغیرہ اور اگر اس کے ساتھ کسی وصف کا خیال بھی شامل ہو تو وہ صفت کہلائے گا مثلاً رازق خالق طویل وغیرہ بعض اہل علم نے اس امر پر حث کی ہے کہ آیا اسم بہ نسبت صفت کے اشرف ہے یا بالعکس جو لوگ اسم کو اشرف مانتے ہیں وہ حسب ذیل دلیل پیش کرتے ہیں اسم بہ نسبت صفت کے مقدم ہے کیونکہ اسم کسی چیز کی ذات پر دلالت کرتا ہے اور صفت اس ذات کی ایک حالت کا نام ہے ظاہر ہے کہ خود چیز کسی چیز کی ذات اس کی کسی حالت پر مقدم ہوا کرتی ہے لہذا اسم تمام صیغہ ہائے صفت کے لئے ماخذ ہوتا ہے جس سے تمام صفات مشتق ہوتے ہیں اور ماخذ کا وجود مقدم ہوتا ہے اور صفت کا موخر یہ بالکل صحیح ہے کہ صیغہ صفت ذات کے علاوہ ایک وصف کا اظہار بھی کرتا ہے اور یہ بات اسم میں نہیں ہوتی اس صورت میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز سے کسی زیادہ علم کا افادہ ہو وہ اشرف ہے مگر حق یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی اصل ذات کا علم نہ ہو اس کے وصف کا علم بے معنے بات ہے لہذا اسم ہی کو اشرف ماننا زیادہ صحیح ہے۔

نفی و اثبات اسماء و صفات

عقائد اسلام میں یہ مسئلہ اہل کلام کے نزدیک نہایت معرکتہ الاراء مسئلہ ہے اور مسئلہ جبر و قدر کی طرح لاینحل سمجھا گیا ہے ہم یہاں صرف مذہب حق اہل السنۃ والجماعت کا ذکر کر دیتے ہیں کیونکہ اختلاف و دلائل کی شرح و بسط کے لئے علم کلام کی کتابیں بھری پڑی ہیں جن کا نتیجہ بجز حیرت و دہشت کے کچھ بھی نہیں بات دراصل یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء علم کلام کو دو متعارض

مقدمے مسئلہ صفات کی بابت مد نظر ہیں اور اس لئے وہ حیران ہیں کہ اس تعارض کو کیونکر دور کیا جائے وہ دو مقدمے یہ ہیں (مقدمہ اولے) وحدت کمال کا نام ہے اور کثرت نقصان کا اس مقدمے کے مان لینے پر اصحاب معقول کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ ذات باری کی توحید پر پورا زور لگائیں چونکہ صفات متعددہ کے اثبات پر ذات باری کے متعلق کثرت کا خیال پیدا ہوتا ہے اس لئے انہوں نے مجبوراً صفات کی نفی کر دی (مقدمہ ثانیہ) چونکہ یہ مسلم ہے کہ ایک ایسی ذات جو علم قدرت، حکمت، ارادہ، کلام، سمع، بصر وغیرہ صفات میں کامل ہو بہ نسبت اس ذات کے جو ان صفات میں ناقص ہو یا ان صفات سے بالکل عاری ہو اکمل واشرف سمجھی جاتی ہے اس لئے انہیں ضروری معلوم ہوا کہ ذات باری کے لئے ان صفات کو ثابت کریں اور چونکہ یہ صفات جائے خود علیحدہ علیحدہ مختلف الماہیۃ ہیں اس لئے ذات باری کے متعلق کثرت کا ماننا بھی ضروری ہوا کچھ شک نہیں کہ بظاہر یہ ہر دو مقدمے متعارض ہیں اور اس تعارض کا دور کر دینا آسان نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر دو مسلک کے ماننے والوں کا مقصد اہم یہی ہے کہ ذات باری کو کامل اور ہر ایک عیب سے منزہ و مبرا مانا جاوے اکثر معتزلہ اور بعض دیگر فرقے مقدمہ اولے پر زور دیتے ہیں اور جمہور اہل علم فرقہ اہل السنۃ و الجماعۃ مقدمہ ثانیہ کو پیش کرتے ہیں اکثر حضرات متصوفہ کا مسلک بھی اس مسئلہ میں معتزلہ کا مسلک ہے اور وہ صفات کو عین ذات تسلیم کرتے ہیں یعنی وہ یہ مانتے ہیں کہ ایک ہی ذات بسیط تمام مختلف قسم کے آثار کا مصدر ہے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس مسلک پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ اس صورت میں قادریت اور عالمیت وغیرہ صفات سب ایک ہی حقیقت ہوں گی۔ اور ان میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں ہو گا۔ اور یہ صحیح نہیں کیونکہ حقیقت واحدہ دو حقیقتوں کا عین نہیں ہو سکتی لہذا ذات اور علم و قدرت وغیرہ ایک حقیقت نہیں اس کے جواب میں قائلین عینیت ذات و صفات کی طرف سے جواب مع دلائل دیئے گئے ہیں جو بتفصیل کتب کلام میں مذکور ہیں۔

جمہور اہل علم (جو صفات کو ذات سے علیحدہ مانتے ہیں۔) اس اعتراض کے جواب دہ ہیں کہ اگر صفات کو حادث مانیں تو ذات باری کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور اگر قدیم مانیں تو متعدد امور کو قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ذات واجب الوجود ہو سکتی ہے نہ متعدد اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ذات باری کے صفات دو قسم کی ہیں (۱) صفات ثبوتیہ (۲) صفات سلبیہ پہلی قسم کے صفات ایک قسم کے اضافات ہیں یعنی محض ایک نسبت یا ربط ہیں جن سے ذات محعہ میں کسی قسم کا تعدد لازم نہیں آتا۔ اور صفات سلبیہ خود مفہوم سلب پر مشتمل ہیں اس لئے وہ بھی موجب تعدد نہیں ہو سکتے پس ہر دو صورت میں تعدد فی الذات لازم نہیں آتا لہذا صفات کا وجود ماننا ضروری ہے واضح ہو کہ ہر دو فریق کے اعتراضات و جوابات اور ردو قدح کا سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ اگر ہم اس کو بالاستیفاء لکھنے کی کوشش کریں تو ناظرین کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور خواہ مخوامہ کتاب کا حجم بڑھانا ہو گا مع ھذا آج کل عام طبائع کو ایسے مباحث دقیقہ فلسفیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ذیل میں ہم اس عقیدہ کی جو اہل السنّت و الجماعۃ کا ہے تشریح کر دیتے ہیں یہ مسلم ہے کہ ذات باری کی حقیقت اور کنہ کا ادراک ناممکن ہے اور وہ خود اپنی ذات کی نسبت لیس کمثلہ شیء ارشاد فرماتا ہے اس لئے انسان ضعیف البنیان جو کچھ صفات کی نسبت تصور کرے گا۔ وہ اس کی اپنی محدود عقل کا نتیجہ ہے مگر ذات باری اس سے بالاتر ہے۔

گفتا غلطی زمانشاں نتواں داد
ازما تو ہر آنچہ دیدہ پایہ تست

ہر ایک شخص نے اپنی رائے پر اعتماد کر کے ایک نہ ایک مذہب قائم کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ ذات باری ہر ایک کے مجوزہ مذہب سے منزہ و مبرا ہے ولنعم ما قیل۔

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامے پر ستند

ہاں جن لوگوں نے کتاب و سنت کو اپنا قدوہ بنالیا ہے اور ارباب معقول کے ڈھکوسلوں سے بیزار ہو چکے ہیں (مثلاً خاکسار مولف) وہ مسئلہ صفات میں بڑی احتیاط کرتے ہیں اور حضرات سلف کے مسلک سے سر مو تجاوز نہیں کرتے ان لوگوں کا اس بات پر ایمان ہے کہ جو کچھ کتاب اللہ اور سنت رسول میں آچکا ہے واجب التصدیق ہے اور بدوں اس کے کوئی طریق خالی از خطر نہیں ہو سکتا صفات ذات باری کی تصدیق ہمیں اس طرح کرنی چاہیے جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہو چکی ہیں کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جس طرح ذات مجہول الکنہ ہے اسی طرح اس کے صفات بھی مجہول الکنہ ہیں اس لئے طریق امن و عافیت یہی ہے کہ ہم ماجاء بہ الرسول پر ایمان لائیں اور ردو قدح کی طرف خیال تک نہ کریں کیونکہ جس قدر باطل فرقے پیدا ہوئے ہیں سب ذات باری اور اس کے صفات میں غور و خوض کرنے کا نتیجہ ہیں بڑے بڑے ائمہ دین نے بجز کتاب و سنت کی پیروی کرنے کے کوئی چارہ نہ دیکھا علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ جو علم کلام کے ایک مشہور امام ہیں اور جن کی کتاب ملل و نحل شہرستانی علمائے علم کلام کے نزدیک بڑی معتبر سمجھی گئی ہے اپنے زمانے کے بے نظیر متکلم تھے چنانچہ کئی ایک دقیق مسائل علم کلام میں ان کے مباحث مشہور ہیں اخیر عمر میں عقلیات سے بیزار ہو کر متمسک بکتاب و سنت ہو گئے اور لوگوں کو بطور وصیت یوں کہا کرتے علیکم بدین العجایز فانہ من اسنے الجوائز یعنی بوڑھی عورتوں کا سا مضبوط دین اختیار کرو کیونکہ یہ گراں قیمت جائزہ ہے پھر لکھتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و سنت میں وارد ہو چکا ہے اس پر بلا حجت سر تسلیم خم کر دو اور عقلیات کے پھندوں سے اپنے تئیں بچاؤ کیونکہ اس میدان میں داخل ہو کر امید نجات بہت کم ہے صحابہ اور تابعین کا یہی مسلک تھا اور تمام اکابر نے اسی طرف رجوع کیا ہے اور میری تمہیں یہی وصیت ہے اگر تم لازم پکڑ لوگے تو بچ جاؤ گے ورنہ منکر کتاب و سنت ہو گے دلائل عقلیہ میں اس قدر تعارض موجود ہے کہ معتزلی اشعری کا اور اشعری معتزلی کا ابطال کر رہا ہے مگر انبیاء علیہم السلام

کے طریق توحید میں کچھ اختلاف نہیں۔

رازی اور عقلیات سے توبہ

امام فخر الدین رازی نے عمر بھر عقلیات میں غلطان و پیچان رہ کر آخر کار طریق سلف صالحین کو اسلم و اصوب قرار دیا اور کہا کہ میں نے عقلیات میں دور دراز تک تحقیق کی اور ہر ایک مسئلہ کی پوری تدقیق کی مگر اطمینان قلب نصیب نہیں ہوا اور اثبات توحید میں جو طریق قرآن مجید نے اختیار کیا وہ نہایت مضبوط اور دل نشین ہے علم کلام پیاسے کی پیاس کو ہرگز نہیں بجھا سکتا ہاں لا الہ الا اللہ کی سادہ تعلیم کا مقابلہ کرنا محال ہے امام الحرمین عبدالملک جو دینی استاد امام حجتہ الاسلام غزالیؒ جو علم کلام کے مشہور مصنف اور علمائے شافعیہ ہیں بڑی قدرو منزلت کے آدمی ہیں علم کلام سے منہ موڑ کر طریق سلف کی طرف متوجہ ہو گئے اور مرتے وقت کہنے لگے کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ میں آج نیشا پور کی بوڑھیوں کے سے دین پر دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ ولنعم ما قیل

لقد طفت فی تلک المعاهد کلها . وسیرت طرفی بین تلک المعالم

فلم ار الا واضعا کف حائر علی ذقن اوقار عاسن نادم

میں نے منزل محبوبہ کے تمام کھنڈرات کی دیکھ بھال کی کہ کہیں ان کا پتہ مل جائے مگر کوئی پتہ نہ چلا اور جس کو وہاں دیکھا حیرت ندامت میں مستغرق پایا۔

ہم نے بطریق اختصار مسلک حق کو واضح کر دیا ہے امید ہے کہ ہر ایک اہل ایمان اسی مسلک کو لازم پکڑے گا کیونکہ صحت ایمان کا صحیح معیار یہی ہے معتقدات میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ آجکل نیچریت اور فلسفیت لوگوں کی طبائع پر غالب آرہی ہے اور صفات باری کو اپنے ناقص عقول کے معیار پر اندازہ کرنے لگ گئے ہیں اور یہ سخت خطرناک مرض ہے۔ معتقدات کے بارے میں سلف صالحین کے مسلک کے سوا سر مو ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے اور موجودہ زمانے کے محققین کو جو مغربی الحاد سے متاثر ہو چکے ہیں اور تاویلات

باطلہ سے ناواقفوں کو بہکاتے ہیں شیاطین الرجال سمجھ کر محترز رہنا چاہیے۔

اسماء ذات باری توقیفی ہیں یا قیاسی

علماء نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ آیا ذات باری کے اسماء توقیفی ہیں یا قیاسی یعنی آیا ذات باری پر انہیں اسماء کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو کتاب و سنت میں وارد ہو چکے ہیں یا ان اسماء کا بھی جن کے معانی ذات باری کے حق میں قرار دینے جائز ہوں اور عقل ان معانی کے ثبوت پر دلالت کرتی ہو؟ جمہور علماء اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ کسی اسم کا اطلاق ذات باری پر صرف سماع پر موقوف ہے ہم اپنی طرف سے کوئی اسم ذات باری کے لئے تجویز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بعض اسماء اس کے شیان شان نہ ہوں مثلاً ہم ذات باری کو عارف عاقل لبیب وغیرہ نہیں کہہ سکتے وجہ اس کی یہ ہے کہ الفاظ معرفت عقل لب بسا اوقات ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو مدرک سے غائب ہونے کے بعد ادراک کئے جائیں اس مسئلہ میں مختلف مذاہب ہیں مگر ہمیں مسلک امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نہایت معتدل معلوم ہوتا ہے لہذا طویل بحث سے اعراض کر کے انہیں کی تحقیق کا خلاصہ قلمبند کر دیتے ہیں امام رازیؒ نے بھی اسی تحقیق کو مختار مانا ہے۔

امام صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ اسماء کا اطلاق اذن شرع پر موقوف ہے اور صفات کا اطلاق بلا اذن جائز ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا اسم وصفت میں امتیاز کرنے پر موقوف ہے اس لئے ہر دو میں پہلے مابہ الامتیاز کا قائم کرنا ضروری ہے سو واضح ہو کہ اسم ایک ایسا لفظ ہے جو کسی مسمی کی ذات پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو مثلاً زید ایک شخص کی ذات پر دلالت کرتا ہے برخلاف اس کے صفت ایک ایسا لفظ ہے جو مسمی کے کسی وصف پر دلالت کرتا ہے مثلاً طویل یا ابیض ظاہر ہے کہ یا زید اور طویل یا ابیض کا مفہوم ایک نہیں کیونکہ یا زید سے صرف اسی شخص کی ذات

مقصود ہے اور یا طویل یا ابیض سے ہمیں کبھی یہ گمان نہیں جاتا کہ طویل و ابیض اسی کے نام ہیں ہاں اگر صیغہ صفت کو کسی شخص کا علم قرار دیں تو پھر وصفی معنے ملحوظ نہیں ہونگے مثلاً قاسم گو صیغہ صفت ہے مگر جب کسی شخص کا نام ہو تو اس سے اس شخص کی ذات ہی مقصود ہو گی اسی طرح لفظ عبداللہ اگر کسی شخص کا نام ہو تو اس کے وصفی معنے مراد نہیں ہوں گے بلکہ اس شخص کی ذات مقصود ہو گی یہی وجہ ہے کہ لفظ عبداللہ کی جمع جبکہ علم ہو عبادلہ لکھا کرتے ہیں اور علم نہ ہونے کی صورت میں عباد اللہ کیونکہ علم ہونے کی صورت میں لفظ عبداللہ اسی طرح مفرد سمجھا گیا ہے جس طرح لفظ زید اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کا اسم وہ لفظ ہوا کرتا ہے جس کو وہ خود یا اس کے والدین یا اس کے آقا اس کے لئے تجویز کیا کرتے ہیں اور اسی کو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص کو اس کا کوئی نیا نام تجویز کرنے کا حق نہیں۔

اسماء الرسول ؐ

اسی طرح جناب پیغمبر علیہ السلام کے اسماء معدودہ ہیں جن کو خود آپ نے ارشاد فرما دیا اور وہ یہ ہیں احمد محمد المقفی' الماحی' العاقب' نبی التوبة' نبی الرحمة' نبی الملحمة ان اسماء شریفہ کے علاوہ ہم حضور علیہ السلام کے لئے کوئی نیا نام اپنی طرف سے تجویز نہیں کر سکتے سو جب ہم کسی شخص کے معین اسم کے علاوہ کوئی اور اسم اس کے لئے تجویز نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیونکر کر سکتے ہیں ہاں بطور اظہار وصف ہم اس ذات مقدس پر الفاظ مرشد ہادیٔ عالم رشید وغیرہ کا اطلاق کر سکتے ہیں مگر ایسے اسماء وصفیہ جن میں کسی قسم کے نقص کا مفہوم ہو ہم اطلاق نہیں کر سکتے مثلاً یا مذل یا معز بول سکتے ہیں۔ کیونکہ صرف یا مذل میں ایک گونہ نقص کا مفہوم پایا جاتا ہے اور جب ہر دو کو ملا کر بولیں تو اس سے مدح کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے حاصل یہ ہے کہ افعال و اوصاف کی نسبت کرتے وقت اجازت شریعت کی ضرورت نہیں مثلاً

موجود' موجد' مظہر' مخفی' مسعد' مشقی' مبقی وغیرہ صفات کا اطلاق صحیح ہے گو شریعت میں ان کا ورود نہیں ہوا مگر بطور اسم کے یہ اطلاق جائز نہیں۔

اسماء باری کے متعلق ابن تیمیہ کی تحقیق

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح کی جلد ثالث کے ایک مقام پر اطلاق لفظ جوہر کی تحقیق میں اس موضوع کے متعلق ایک مختصر سی تقریر کی ہے مناسب نظر آتا ہے کہ اس کا خلاصہ بھی درج کیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ اسماء ذات باری کے متعلق اہل اسلام کے دو فریق ہیں ایک فریق کا خیال ہے کہ وہی اسماء ذات باری پر اطلاق کئے جا سکتے ہیں جو شریعت میں آ چکے ہیں کیونکہ اسماء کا ذکر بغرض عبادت ہے اور عبادت کا مدار صرف سمع پر موقوف ہے جس میں تجویز عقل کو کچھ دخل نہیں دوسرے فریق کا خیال ہے کہ جس اسم کے معنی لغت کی رو سے صحیح ہوں اور ذات باری کے لئے وہ معنی ثابت ہوں تو ایسے اسم کا اطلاق اس پر جائز ہے کیونکہ شارع علیہ اسلام نے ہمیں ایسے اطلاق سے منع نہیں فرمایا۔

ان ہر دو مذہب کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ صحیح تیسرا مذہب ہے اور وہ یہ ہے کہ اطلاق اسم سے دو امر ملحوظ ہوتے ہیں بغرض عبادت ذکر میں زبان پر لانا یا اس ذات مقدس کی بابت کسی امر کی خبر دینا جب اسماء کو بغرض عبادت بولیں تو کچھ شک نہیں کہ صرف انہیں اسماء کا استعمال صحیح ہو گا جن کا شریعت میں ورود ہو چکا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَائِهٖ اور جب اس کی ذات کے متعلق کسی امر کی خبر دینا مقصود ہو تو اس صورت میں کسی ایسے اسم کا اطلاق صحیح ہے جو شریعت میں وارد نہیں ہوا۔ خواہ وہ عربی ہو یا فارسی ہو یا ہندی وغیرہ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس اسم سے ایسے معنی کا اظہار ہوتا ہو جو ذات باری کے لئے ثابت ہیں انتہائی غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ مسلک وہی امام صاحب ہی کا مسلک ہے کوئی

نئی بات نہیں۔

حدیث اسماء حسنیٰ کے متعلق چند مباحث

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً من احصاھا دخل الجنۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص انہیں (بطور ذکر و دعا) شمار کرے گا جنت میں داخل ہو گا نیز ایک دوسری روایت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ میں یوں وارد ہوا ہے ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً مائۃ الا واحداً من احصاھا دخل الجنۃ انہ وتر یحب الوتر اس کے بعد اس روایت میں ننانوے اسماء کی تفصیل مذکور ہے اس حدیث میں چند سوال قابل غور ہیں۔

(۱) پہلی روایت میں جو بہ نسبت دوسری روایت کے قوی ہے اسماء کی تفصیل کیوں مذکور نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عدم تفصیل میں یہ مصلحت ہے کہ لوگوں کو جمیع اسماء و صفات پر مواظبت کرنے کا موقع ملے اور اس تفصیل کا اخفاء بعینہ ایسا ہے جیسے صلوٰۃ وسطیٰ اور لیلۃ القدر کا مخفی رکھنا کیونکہ تعیین سے لوگوں کو طلب اور شوق نہیں رہتا۔

(۲) عدد ننانوے کو مخصوص کر دینے سے یہ خیال گذرتا ہے کہ اسماء ذات باری صرف ننانوے ہیں اگر اس سے صرف اسماء بلاصفات مقصود ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ ننانوے تو بجز لفظ اللہ کے سب صفات ہیں پھر انہیں اسماء کہنے سے کیا مطلب؟ اور اگر یہ ننانوے صفات ہیں تو سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ جب صفات لامتناہی ہیں تو ننانوے میں حصر کرنا کیسے صحیح ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ننانوے کی تخصیص سے یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا کہ اسماء ذات باری صرف ننانوے ہی ہیں بلکہ اس تخصیص کی دو وجہ ہو سکتی ہیں اول یہ ممکن ہے کہ یہ اسماء دیگر اسماء کی نسبت اعظم و اجل ہوں دوم جملہ ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً کو کلام تام نہ سمجھیں بلکہ مجموع کلام یعنی ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً

من احصاھا دخل الجنۃ کو کلام تام سمجھیں مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ایسے ہیں کہ جو شخص انہیں (بطور ذکر) تلاوت کرے وہ جنت میں داخل ہو گا اور اس کا وزن بعینہ یہ جملہ ہو گا ان للملک تسعۃ وتسعین مقاتلاً اعدھم للحرب یعنی بادشاہ کے پاس ننانوے ایسے بہادر ہیں جن کو اس نے لڑائی کے لئے تیار کر رکھا ہے اس جملہ سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ ننانوے بہادروں کے سوا اس کے پاس اور بہادر نہیں چنانچہ اس کی تائید میں ایک حدیث صحیح موجود ہے جو بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی مشکل پیش آئے اور وہ یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے دعا یہ ہے اللھم انی عبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک ماض فی حکمک عدل فی قضائک اسئلک بکل اسم ھولک سمیت بہ نفسک اوانزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک او استاثرتبہ فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع خاطری و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب ھمی و غمی۔

اس دعاء ماثورہ میں جو ہر ایک مسلمان کو حفظ کر کے بطور ورد ہر روز پڑھنا چاہیے خصوصاً کسی مصیبت یا مشکل کے وقت الفاظ اواستاثرت بہ فی علم الغیب عندک سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ذات باری عزاسمہ کے کچھ اسماء ایسے بھی ہیں جن کا علم صرف اسی ذات تک محدود ہے اور غیر کو ان پر اطلاع حاصل نہیں۔

(ج) کیا وجہ ہے کہ یہ اسماء پورے سو نہیں بلکہ ایک کم ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے اول تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کو مقدار عبادات کی تعیین میں جو حکمتیں مدنظر ہیں گو ہمیں ان کا علم نہ ہو مگر ہمیں بلاحجت تسلیم کر لینا چاہیے مثلاً مختلف نمازوں کی تعیین اوقات و رکعات وغیرہ کی حکمت کے متعلق ہم کوئی وجہ قطعی قرار نہیں دے سکتے اس کی کئی

ایک مثالیں شریعت میں موجود ہیں مثلاً عشاء کی نماز میں دو رکعت سنت کا بعد از فریضہ قرار دینا اور فجر کی نماز میں قبل از فریضہ یا ملائکہ جہنم کا شمار انیس بتلانا یا ماہ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزوں کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر قرار دینا یا ذکر سبحان اللہ کا ثواب دس گنا اور الحمدللہ کا بیس گنا اور لا الہ الا اللہ کا تیس گنا اور اللہ اکبر کا چالیس گنا ہونا۔

(ان احکام کی گو شریعت میں تصریح نہیں ہوئی۔ مگر علماء نے وجوہ حکمت تجویز کئے ہیں۔ مثلاً عشاء کی نماز میں فریضہ کے بعد اور فجر میں فریضہ سے پہلے سنت کا قرار دینا اس حکمت پر مبنی ہے کہ رات کو دن بھر کی تکان اور ثقل غذا کی وجہ سے آناً فاناً نیند غلبہ کرتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے فریضہ ادا کر لیا جاوے تاکہ اگر کچھ خلل ہو تو سنت میں ہو نہ فریضہ میں اور فجر میں برعکس حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ نیند سے بیدار ہونے والا دیر تک ہوش و حواس نہیں سنبھالتا۔ اس لئے پہلے سنت ادا ہونی چاہئے۔ تاکہ اگر کچھ خلل ہو تو سنت میں ہو نہ فریضہ میں اسی طرح ملائکہ جہنم کا شمار انیس بتلانا۔ اس حکمت پر مبنی ہے کہ آٹھ پہر کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں پانچ نماز ہائے پنجگانہ میں محسوب ہوئے باقی انیس کی جواب وہی انسان کے ذمہ ہے جن میں کوئی نہ کوئی گناہ ہو ہی رہتا ہے کم از کم غفلت کا گناہ تو ضرور ہی عائد ہوتا ہے۔ بعض علماء نے اس انیس کی تعداد کے اور وجوہ بھی قرار دے ہیں ہم نے بوجہ طوالت انہیں قلمبند نہیں کیا اسی طرح شوال کے چھ روزوں کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر محسوب ہونا اس حکمت پر مبنی ہے کہ تیس اور چھ مل کر چھتیں روزے ہوئے چونکہ ہر ایک نیکی کا ثواب دس گنا بارگاہ رب العزت سے دیا جاتا ہے اس لئے چھتیس کا دس گنا سال بھر کے برابر ہوا اسی طرح سبحان اللہ کا ذکر ایک دفعہ کرنے سے دس گنا ثواب ملتا ہے ظاہر ہے کہ جب الحمدللہ کہے گا تو بیس گنا ہوگا علیٰ ہذا تیس گنا اور چالیس گنا)

وجہ دوم یہ ہے کہ ننانوے کی تخصیص کر دینے میں اس امر کی طرف

اشارہ ہے کہ ذات باری کے اسماء قیاسی نہیں بلکہ صرف سمعی ہیں جو اجازت شریعت پر موقوف ہیں اس وجہ کو محمد بن عبدالملک طبری نے لکھا ہے اور امام رازی نے اسے پسند کیا ہے۔

وجہ سوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر (طاق) شفع (جفت) کی نسبت اشرف ہے۔ کیونکہ وتر میں فردانیت پائی جاتی ہے جو وحدت کا نتیجہ ہے اور وحدت صفت ذات باری ہے مع ھذا وتر شفع کا محتاج نہیں اور شفع وتر کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا نیز شفع کا نصف ضروری ہے کہ عدد صحیح ہو۔

اور وتر صحیح عدد میں تنصیف قبول نہیں کرتا اور قبول قسمت ضعف پر دلالت کرتا ہے اور عدم قبول قوت پر مگر وتر کے افضل و اشرف ہونے میں صحیح توجیہ یہ ہے کہ واحد تمام اعداد کا منبع ہے اگر واحد نہ ہو تو دو تین چار پانچ وغیرہ کا کوئی وجود نہیں اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وتریت تمام مراتب اعداد میں موجود ہے اور شفعیت میں یہ وصف نہیں لہذا وتر شفع پر غالب ہے ان اللّٰہ وتر یحب الوتر (د) روایت ثانیہ میں تسعة و تسعین مائة الا واحداً واقع ہوا ہے اور اس میں تکرار ہے جو بظاہر منافی بلاغت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تکرار مبنی علی التاکید ہے جیسے ثلاثة فی الحج و سبعة اذا رجعتم کے بعد فرمایا تلك عشرة كاملة اور ایک دوسری روایت میں لاتتخذوا الھین اثنین فرمایا حالانکہ الھین سے دو کا مفہوم صاف واضح تھا مگر اثنین بطور تاکید زیادہ کیا گیا اور تاکید معنی عند الضرورت بلاغت ہے مع ھذا تسعة و تسعین کی جگہ اگر کبھی کاتب غلطی سے سبعة وسبعین لکھ دے تو جملہ مائة الا واحداً اس تصحیف کی تصحیح کر سکتا ہے۔

(د) اس حدیث میں محدثین نے بحث کی ہے امام احمد اور بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور ترمذی بھی اس کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس ضعف کے متعلق چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ صحیحین میں تفصیل اسماء مذکور نہیں ہوئی دوم ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ سے دو روائتیں مسطورہ بالا مروی ہیں اور ہر دو میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے سوم اسماء مذکورہ فی الحدیث میں اسم رب کا ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ قرآن مجید میں مذکور ہے اور ایسے ہی اسم حنان و اسم منان کا ذکر نہیں آیا حالانکہ اخبار صحیحہ میں یہ ہر دو اسم مذکور ہیں چہارم روایت مذکورہ بالا میں اسماء جس ترتیب سے مذکور ہیں وہ ترتیب احسن نہیں سمجھی گئی کیونکہ ترتیب احسن یہ ہے کہ پہلے اسماء ذات مذکور ہوں پھر اسماء حیات پھر اسماء علم و قدرت وغیرہ پھر دیگر اسماء صفات مثلاً خالق و رازق و مبدی و معید وغیرہ مگر روایت مذکورہ میں یہ ترتیب ملحوظ نہیں بلکہ اس کے برعکس اسماء صفات کا ذکر ہوا ہے چنانچہ پہلے محیی و ممیت کا ذکر کر کے بعد ازاں اسم حی کا مذکور ہوا ہے حالانکہ ترتیب احسن کی رو سے اسم حی پہلے مذکور ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض اسماء دیگر بعض کی نسبت اشرف و اعظم ہیں تو اس لحاظ سے بھی روایت مذکورہ بالا میں لم ترتیب احسن کو ملحوظ نہیں رکھا گیا البتہ پہلے دو اسموں یعنی اللہ اور رحمٰن میں تو اس ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر بعد کے اسماء میں یہ ترتیب قائم نہیں رہ سکی ان وجوہ ضعف کا جواب علماء نے صرف یہ دیا ہے کہ روایت ثانیہ جو تفصیل اسماء پر مشتمل ہے چنداں قوی نہیں مگر چونکہ اکثر اسماء و صفات مفصلہ فی الحدیث کا ذکر قرآن و احادیث میں آچکا ہے اور عقل بھی ان کے مدلولات کو منجملہ کمالات ذات باری کے تسلیم کرتی ہے لہذا اس کے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں رہا۔ حسن ترتیب کا سوال سو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ترتیب مذکورہ فی الحدیث میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے حکم و مصالح ملحوظ ہوں جن کا ہمیں علم نہیں لہذا وہ واجب التسلیم والتصدیق ہیں۔

(و) حدیث مذکورہ بالا میں لفظ احصاھا واقع ہوا ہے اس کا صحیح مفہوم یہاں کیا ہے؟

اس سوال کے متعلق علماء نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں اول یہ کہ احصاء بمعنے شمار کرنے کے ہے مطلب یہ ہو گا کہ جو شخص اسماء مذکورہ بالا کو

دعاء میں بطور ذکر پورا شمار کرے تو وہ داخل جنت ہو گا مگر اس توجیہ پر بعض علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کو بذل نفس اور بذل مال کے ساتھ مشروط کیا ہے پھر صرف ان اسماء کے تلاوت کرنے سے جنت کا استحقاق کیسے ہو سکتا ہے قال اللّٰه تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں سے ان کے نفسوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے دوم یہ کہ لفظ احصاء بمعنی شمار سے صرف شمار زبانی مراد نہیں بلکہ ایسا شمار جو مقرون بالعقل ہو اس طرح کہ بندہ اپنے رب کو اس کے صفات کاملہ کے ساتھ یاد کرے اور تمام اشیاء موجودات کو اس کے صفات کاملہ کا مظہر جانے سوم احصاء بمعنی اطاقة کے بھی مستعمل ہے علم ان لن تحصوه ای لن تطیقوه اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے استقیموا ولن تحصوا ای لن تطیقوا کل الاستقامة یعنی تم پوری استقامت نہیں کر سکو گے اس توجیہ کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص ان اسماء اللہ کی رعایت حرمت کی کامل قدرت رکھتا ہو وہ داخل جنت ہو گا اور رعایت حرمت سے مراد حقیقت احسان کو بجا لانا ہے جس کو حدیث جبرئیل میں بدیں الفاظ بیان فرمایا ہے۔ ان تعبداللّٰه کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك یعنی احسان کی حقیقت یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر ادا کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ رتبہ حاصل نہ ہو سکے تو اتنا ہی سہی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے اس توجیہ اور توجیہ ثانی میں یہ امتیاز ہے کہ ثانی سے صرف علم صفات مراد ہے اور ثالث سے پورا حق عبودیت ادا کرنا چہارم یہ کہ روایت مرویہ صحیحین کی توجیہ جو تفصیل اسماء سے عاری ہے یوں ہو سکتی ہے کہ لفظ احصاء کو معنے طلب پر محمول کیا جائے یعنی جو شخص قرآن و احادیث صحیحہ میں ننانوے اسماء کی تلاش و تفحص کرے وہ داخل جنت ہو گا ظاہر ہے کہ اس طور پر ننانوے اسماء کا انتخاب کرنا علم اصول و فروع میں پوری مہارت رکھنے پر موقوف ہے اور جو شخص اس درجہ تک علوم دینیہ کا مجتہد ہو گا۔

وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستحق جنت ہو گا۔ وَ ذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

فضیلت ذکر اسماء حسنی

اس موضوع کے اثبات میں قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ موجود ہیں قرآن مجید میں اس کے متعلق چار آیات وارد ہوئی ہیں۔

(۱) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْ اَسْمَائِهٖ (اعراف)

(۲) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل)

(۳) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (طه)

(٤) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (حشر)

لفظ حسنے بروزن فعلی صیغہ مونث افعل التفضیل کا ہے جس کا صیغہ مذکر احسن ہے جیسے عظمی اور کبری کہ یہ ہر دو صیغہ مونث ہیں جن کے صیغہ مذکر اعظم و اکبر ہیں ان اسماء کو حسنے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسماء صفات کمالیہ ذات باری پر دلالت کرتے ہیں یا یوں کہو کہ معانی حسنہ مثلاً وحدانیت جلال عزت احسان وغیرہ پر مشتمل ہیں اور آیۃ سورۃ اعراف میں الحاد فی الاسماء کا ذکر ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسماء ذات باری کے متعلق عقائد کا صحیح علم حاصل کرنا عین ایمان ہے الحاد امر حق سے میلان کر جانے کو بولتے ہیں اور اسماء ذات باری میں الحاد یہ ہے کہ ایسے امور کی نسبت اس ذات مقدس کی طرف کی جائے جس سے وہ بری ہے جیسے عیسائی اس کو جوہر اور مسیح علیہ السلام کا باپ کہتے ہیں یا بعض اسلامی فرقے اس کو ایک جسم مانتے ہیں ان لوگوں کو مجسمہ کہتے ہیں اور الحاد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن صفات کاملہ کی وہ ذات مستحق ہے ان کی نفی کر دی جائے جیسے معتزلہ جنہوں نے ذات باری کے صفات کا انکار کر دیا حالانکہ نصوص قرآنیہ صاف طور پر صفات کو ثابت

کرتی ہیں۔

فضیلت ذکر میں بہت سی آیات وارد ہیں منجملہ ان کے ایک یہ آیت ہے فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ اس آیت میں ہمیں دو امر کی ہدایت کی گئی ہے اول ذکر دوم شکر مگر ذکر کو مقدم رکھا ہے کیونکہ ذکر محض اس ذات مقدسہ کے ساتھ مشتغل ہونے کو کہتے ہیں اور شکر میں غیر اللہ یعنی نعمت منعم کا خیال بھی ہوتا ہے ذکر کی بالعموم تین صورتیں ہیں ذکر باللسان ذکر بالقلب ذکر بالجوارح (دست و پا) ذکر باللسان سے وہ الفاظ مراد ہیں جو ذات باری عزاسمہ کی تحمید و تمجید و تسبیح پر دلالت کرتے ہیں اور ذکر بالقلب کے تین اقسام ہیں اول دلائل ذات و صفات میں تفکر کرنا دوم تکالیف شرعیہ یعنی احکام کے دلائل میں تفکر کرنا جس سے احکام کی حکمتیں اور ان کے اسرار منکشف ہوتے ہیں سوم مخلوقات ذات باری کے اسرار میں تفکر کرنا جس سے تفکر کرنے والے کو تمام ذرات کائنات عالم غیب کا صحیح نقشہ بن کر نظر آئیں ذکر بالجوارح کی یہ صورت ہے کہ تمام اعضاء بیرونی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مقصور ہو کر ممنوعات سے محفوظ ہو جائیں چنانچہ انہیں معنی میں اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کو لفظ ذکر سے تعبیر کیا ہے۔

مذکورہ بالا ہرسہ اقسام ذکر میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ آیت اذکرونی میں ہرسہ طریق ذکر داخل ہیں اور اذکرکم کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہرسہ غایات کرامات و خیرات مضمر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں غایت شریعت اور غایت طریقت اور غایت حقیقت کے انعامات سے بہرہ یاب کرتا ہے گویا ہرسہ اقسام ذکر کے مقابل میں ہرسہ اقسام خیرات کے عطا کئے جاتے ہیں اور آیت وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا میں بھی انہیں ہرسہ مراتب خیرات کی طرف بالفاظ عفو مغفرت رحمت اشارہ کیا گیا ہے اور سورۃ واقعہ کے اخیر میں جو الفاظ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ وارد ہوئے ہیں انہیں ہرسہ مراتب خیرات کی طرف

اشارہ کرتے ہیں آیت اُذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ کی تفسیر میں مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(ا) اذکرونی بالنعمة اذکر کم بالرحمة ترجمہ۔ یعنی تم میری نعمت کے ساتھ مجھے یاد کرو میں اپنی رحمت نازل کر کے تمہیں یاد کروں گا۔

(ب) اذکرونی بالدعاء اذکر کم باعطاء النعماء یعنی تم مجھے دنیا میں پکارو میں تمہیں اپنی نعمت عطا کروں گا۔

(ج) اذکرونی فی الدنیا اذکر کم فی العقبی یعنی تم مجھے دنیا میں یاد رکھو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔

(د) اذکرونی فی الخلوات اذکر کم فی الفلوات یعنی تم مجھے خلوتوں میں یاد کرو میں تمہیں جنگلوں میں یاد کروں گا۔

(ہ) اذکرونی فی الرخاء اذکر کم فی وقت الرجاء یعنی تم مجھے فراغت اور فراخی کے وقت یاد کرو میں تمہیں ضرورت کے وقت یاد کرونگا۔

(و) اذکرونی بطاعتی اذکر کم بمعونتی یعنی تم مجھے طاعت کے ساتھ یاد کرو میں اپنی اعانت سے تمہیں یاد کروں گا۔

(ز) اذکرونی بالصدق والا خلاص اذکر کم بالخلاص و مزید الاختصاص یعنی تم مجھے صدق اور اخلاص سے یاد کرو میں تمہیں نجات دیکر اور زیادہ خصوصیت عطا فرما کر یاد کروں گا۔

(ح) اذکرونی بالربوبیة فی الفاتحة اذکر کم بالرحمة والمعونة فی الخاتمة یعنی تم آغاز میں مجھے ربوبیت کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں اخیر پر اپنی رحمت اور مدد کے ساتھ یاد کروں گا۔

(ط) اذکرونی بالخوف والرجاء اذکر کم بالا من والا عطا یعنی تم مجھے خوف اور رجا کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں امن و عطا کے ساتھ یاد کروں گا۔

(ی) اذکرونی بالشکر اذکرکم بالزیادة یعنی تم مجھے شکر کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں زیادتی نعمت کے ساتھ یاد کرونگا۔

اور مجملہ آیات ذکر کے ایک یہ آیت ہے وَالذَّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً وَالذَّاکِرَاتِ اَعَدَّاللّٰہُ لَھُمْ مَغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْماً اس آیت کے ما قبل میں مختلف افعال خیر کے عاملین کا ذکر ہے اور اس کو عمل ذکر کرنے والوں پر ختم کیا ہے اور مجملہ آیات ذکر کے ایک یہ آیت بھی ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْراً کَثِیْراً اس آیت میں بھی ذکر کثیر کی تلقین فرمائی ہے اور ذکر کثیر کی فضیلت احادیث میں بھر تح تمام موجود ہے عبداللہ ابن بشیر مازنی سے روایت ہے کہ ایک اعرابی جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا یارسول اللہ افضل الناس کون شخص ہے ؟ آپ نے فرمایا اس شخص کے لئے خوشخبری ہو جس کو عمر لمبی ملی اور اعمال صالحہ بجا لایا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کونسا عمل افضل ہے آپ نے فرمایا ان تفارق الدنیا ولسانك رطب بذکر اللہ یعنی تیرا دنیا کو اس حالت میں چھوڑنا کہ تیری زبان ذکر اللہ سے تر ہو یعنی تو ذکر کرتے کرتے جان دیدے کیفیت ذکر کو اللہ تعالیٰ نے بالفاظ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّ قُعُوْداً وَعَلٰی جُنُوْبِھِمْ خود بیان فرمایا ہے اس آیت میں انسانی زندگی کے ہر سہ حالات میں ذکر کی ضرورت کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ انسان ہر سہ حالات میں سے کسی ایک نہ ایک حالت میں ضرور ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ لیل و نہار بر و بحر' سفر و حضر غنا و فقر صحت و مرض میں ذکر کو مت چھوڑ دو اب چوتھی کوئی صورت متصور نہیں بعض محققین نے اس آیت کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم بطور فرض کے انسان پر عائد نہیں کیا جس کے لئے ایک حد معین نہ کی ہو اور اس کے متعلق بعض حالات میں انسان کو معذور نہ رکھا ہو مگر ذکر کے متعلق نہ تو کوئی حد مقرر کی ہے نہ کسی حالت میں کسی کو معذور قرار دیا ہے الا مجنون اور فاتر العقل پھر فرمایا اُذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَاءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْراً یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسے یاد کرو جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ یا اس سے بھی زیادہ علماء نے اس تشبیہ میں چند ایک توجیہات کا ذکر کیا ہے۔

(ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہاری کوتاہی عمل سے آگاہ ہوں اگر تم اپنی اولاد کی طرح مجھے یاد نہیں کر سکتے تو اپنے آباء کی طرح ہی یاد کرو۔

(ب) انسان کا قاعدہ ہے باپ کی یاد تعظیم کیساتھ کرتا ہے اور بیٹے کی یاد شفقت کے ساتھ اور جناب باری کے شایان شان تعظیم ہے نہ شفقت۔

(ج) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان تیرے ظاہری وجود کا سبب تو تیرا باپ ہے اور حقیقی سبب میں ہوں سو تم مجھے ایسے یاد کرو جیسے باپ کو اور میں تمہیں ایسا پیار کرتا ہوں جیسا باپ اپنے بیٹے سے گو میری ذات باپ اور بیٹے کی نسبت سے بری ہے۔

(د) بیٹا صرف اپنے باپ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے اور اس ایک ہی نسبت پر اس کا فخر ہوتا ہے اور اگر کسی غیر کی طرف منسوب ہو تو اس نسبت سے وہ عار کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صرف میری ہی معبودیت تک محدود رہو کسی غیر کی طرف ہونے سے حیاء کرو کیونکہ یہ شرک ہے جو ظلم عظیم ہے۔

(ہ) انسان مصیبت کے وقت اپنے باپ سے زیادہ کسی کو اپنا شفیق نہیں سمجھتا اور اسی سے امداد طلب کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے ایسا یاد کرو جیسے بچہ مصیبت کے وقت اپنے باپ کو یاد کیا کرتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی شخص کے باپ کو برائی سے یاد کرنا انسان کے لئے موجب غضب ہوا کرتا ہے اسی طرح جب میری ذات مقدس کو کوئی برائی سے یاد کرے تمہیں غیرت سے کام لینا چاہیے۔

(ز) سب سے پہلے بچہ جب بولنا سیکھتا ہے تو اب یا ابا اس کے منہ سے نکلتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح ہر ایک کام کے شروع میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔

(ح) انسان ہمیشہ اپنے آباء و اجداد کا ذکر خیر کیا کرتا ہے اسی طرح ضروری

ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی تسبیح و تحمید کو جاری رکھے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکمت ذکر کو بھی قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے جس کی دو صورتیں ہیں ایک تو آیۃ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ میں مذکور ۱
ہے اس آیت کی توجیہ دو طرح ہو سکتی ہے اول تو یہ کہ ماسوا ذات باری کے تمام مخلوقات ممکن لذاتہ ہے اور جو چیز ممکن لذاتہ ہے وہ محتاج الی الغیر ہے اس لئے سوا ذات باری کے کوئی چیز اس قابل نہیں کہ موجب اطمینان ہو سکے کیونکہ جو چیز خود محتاج ہے وہ کبھی مقطع حاجت نہیں ہو سکتی چونکہ ذات باری واجب بذاتہ ہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کی حاجت کا مقطع قرار پا سکے لہٰذا اس کا ذکر موجب اطمینان قلب ہے دوم یہ کہ انسان کی حاجات غیر متناہی ہیں اور مخلوقات متناہی ہے اور متناہی کو غیر متناہی سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم انسان کی حاجات کو پورا کر سکتا ہے اور اسی لئے وہ موجب اطمینان قلب ہے۔

حکمت دوم آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ میں بیان کی گئی ہے اس آیت میں متقین کی اس حالت کا بیان ہوا ہے جو کسی وسوسہ شیطانیہ کے پیدا ہونے پر ہوتی ہے یعنی جب شیطان قلب مومن پر کسی قسم کی ظلمت ڈالتا ہے تو وہ لوگ جھٹ ذکر اللہ کی طرف رجوع کر کے صراط مستقیم پر آجاتے ہیں اور اس طرح شیطان کے تصرف سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ ذکر اللہ موجب ورود انوار ہے جس سے تمام بشری ظلمات دور ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں قرآن مجید میں منافع کا ذکر بیان کیا گیا ہے ذکر سے اعراض کرنے کے مفاسد کا ذکر بھی وارد ہوا ہے ان مفاسد کی چار صورتیں ہیں۔

(ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ

قَدۡكُنۡتُ بَصِيۡرًا قَالَ كَذَالِكَ اَتَتۡكَ اٰيَاتُنَا فَنَسِيۡتَهَا وَ كَذَالِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ جو شخص اس کے ذکر سے اعراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مرنے کے بعد ایک بری زندگی اور تنگی عیش میں مبتلا کرتا ہے اور قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا اور جمال خداوندی کے دیدار سے محروم رہے گا۔

(ب) وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص ذکر اللہ سے منہ پھیر لیتا ہے اللہ تعالیٰ ایک شیطان کو اس کا ساتھی بنا دیتا ہے جو ہر وقت اس شخص پر متصرف رہتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اس کو لے جاتا ہے۔

(ج) وَمَنۡ يُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهٖ يَسۡلُكۡهُ عَذَابًا صَعَدًا اس آیت میں بھی ذکر سے اعراض کرنے پر وعید عذاب سنائی گئی ہے اور عذاب اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص نہ تو دنیا میں حیوۃ طیبہ کا مالک ہو سکتا ہے نہ آخرت میں انعام رحمت کا مستحق اور یہی ایک بھاری عذاب ہے۔

(د) لَاتُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَا اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذَالِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخَاسِرُوۡنَ اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص دنیوی تعلقات میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے وہ زیانکار ہوتا ہے۔

فضیلت ذکر کی نسبت یہی کافی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقام عبودیت میں ملائکہ کے علو درجہ کو ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ يُسَبِّحُوۡنَ لَهٗ بِاللَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَهُمۡ لَايَسۡئَمُوۡنَ یعنی رات دن اس کی تسبیح پکارتے ہیں اور اکتاتے نہیں پھر فرمایا يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح حمد کے ساتھ پکارتے ہیں اور افراد انسانی کے حق میں فرمایا رِجَالٌ لَاتُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَلَابَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ یعنی مساجد میں ایسے بھی مردان خدا ہیں۔ جنہیں خرید و فروخت وغیرہ معاملات اللہ تعالیٰ کے ذکر سے باز نہیں

رکھتے۔

فضیلت ذکر احادیث میں بصراحت تمام مذکور ہے بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا انا عندظن عبدی بی وانا معه اذاذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منهم وان تقرب منی شبراً تقربت منه ذراعاو ان تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا وان اتانی یمشی اتیته هرولة یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے ساتھ ویسا ہی ہوں جیسا وہ میرے حق میں گمان رکھتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں ذکر کرتا ہے تو میں اس جماعت سے بہتر جماعت (ملائکہ) میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ بھر اس سے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں بڑی جلدی سے قدم اٹھا کر اس کی طرف پہنچتا ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ اذا ذکرالعبدربه کتب اللّٰه له ذالك فی صحیفته ثم یعارض الملائكة یوم الخمیس فیریهم اللّٰه ذکر عبده له بقلبه فتقول الملائکة ربنا کل عمل هذا العبد احصیناه اما هـذافلا نعرفه فیقول اللّٰه تعالیٰ ان عبدی ذکرنی بقلبه فاثبته فی صحیفته فذالك قوله تعالیٰ اِنَّا كُنَّا نَسۡتَنۡسِخُ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ

یعنی جس وقت بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس شخص کے نامہ اعمال میں لکھ لیتا ہے پھر پنجشنبہ کے دن گروہ ملائکہ کے سامنے اس کے نامہ کو مقابلۃً پیش کر کے اپنے بندہ کے ذکر کو جو اس نے اپنے دل میں کیا ہوتا ہے دکھاتا ہے تب ملائکہ کہتے ہیں کہ خدایا اس بندے کے تمام اعمال کو ہم نے ضبط کر رکھا ہے مگر اس کے فلاں عمل کو جو اس نامہ میں لکھا ہے ہم

نہیں جانتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا تھا میں نے اس کو اس کے نامہ اعمال میں درج کر دیا اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ کے یہی معنی ہیں۔

پھر فرمایا ذکر الله علم الایمان و حصن من الشیطن و براء ة من النفاق و حرزمن النار یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ایمان کی علامت اور شیطان سے بچنے کے لئے قلعہ اور نفاق سے بریت اور دوزخ سے پناہ ہے۔

پھر فرمایا مامن عبدیقع جنبه علی الفراش ویذکر اللّٰه الا کتب ذاکرا الی ان یستیقظ یعنی بندہ جب سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر کے سوتا ہے تو بیدار ہونے تک وہ ذاکر ہی لکھا جاتا ہے اور بروایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے قال قال رسول الله صلیٰ الله علیه وسلم یا رب و ددت ان اعلم من تحب من عبادك فاحبه فقال اذا رایت عبدی یکثر ذکری فانا احبه و اذارایت عبدی لا یذکرنی فانا ابغضه یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ خدایا میں چاہتا ہوں کہ تیرے اس بندے کو جانوں جس کو تو اپنے بندوں میں سے دوست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تو کسی بندے کو دیکھے کہ میرا ذکر بہت کرتا ہے تو جان لے کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور جب تو کسی بندے کو دیکھے کہ وہ میرا ذکر نہیں کرتا تو جان لے کہ میں اسے دشمن رکھتا ہوں۔

اور بروایت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبق المفردون قیل ومن المفردون قال المشتهرون بذکر اللّٰه یضع لذکر عنهم القالهم فیاتون یوم القیامة خفافاً یعنی مفردون سبقت لے گئے صحابہ نے پوچھا مفردون کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ وہ لوگ جو ذکر اللہ میں مشہور ہو گئے ہیں ایسے لوگوں سے ذکر تمام بوجھوں کو اتار دیتا ہے اور قیامت کو سبکدوش ہو کر خدا تعالیٰ کے سامنے آئیں گے اور بروایت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے الا انبئکم بخیر

اعمالکم وازکاها وارضاها عندملیککم وار فعهافی درجاتکم قالوابلی وماذالك یا نبی اللّٰه قال ذکر اللّٰه یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آیا میں تمہیں ایسے عمل پر آگاہ نہ کروں جو تمام اعمال سے بہتر اور سب سے پاکیزہ اور سب سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث اور سب سے بڑھ کر مدارج کو بلند کرنے والا ہو صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ فرمائیے وہ کونسا عمل ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

اور بروایت عبد اللہ بن بشر مازنی مروی ہے جاء اعرابی الی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فقال ای الناس خیر فقال طوبی لمن طال عمره و حسن عمله فقال یا رسول الله ای الاعمال افضل فقال ان تفارق الدنیا ولسانك رطب من ذکر اللّٰه یعنی ایک اعرابی خدمت اقدس نبویؐ میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کونسا عمل بہتر ہے آپ نے فرمایا خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جس کی عمر لمبی ہو اور وہ اعمال صالحہ بجا لاتا ہو اعرابی نے پوچھا یا رسول اللہ کونسا عمل افضل ہے آپ نے فرمایا کہ تو دنیا کو ایسی حالت میں چھوڑے کہ ذکر اللہ سے تیری زبان تر ہو۔

فضیلت ذکر میں اس حدیث کو غور سے پڑھو قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان یعنی دو کلمے ایسے ہیں کہ جن کا زبان پر جاری ہونا تو بالکل آسان ہے مگر قیامت کو میزان حسنات میں ان کا بڑا بوجھ ہو گا وہ کلمات یہ ہیں سبحان اللّٰه و بحمده سبحان اللّٰه العظیم

اور بھی بہت سی احادیث فضیلت ذکر میں وارد ہیں مگر بقدر کفایت ہم نے چند ایک کا ذکر کر دیا ہے۔

حقیقۃ الدعاء

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مادی اسباب کا سلسلہ قائم کیا ہے اسی طرح

روحانی سلسلہ اسباب کو بعض امور کے ساتھ تعلق دیا ہے جن کے وجود اور ضرورت سے کسی صورت میں انکار نہیں ہو سکتا منجملہ ایسے اسباب کے دعاء بھی ایک سبب ہے جس کو اکثر حالات میں کسی امر کے اسباب مناسبہ کے مہیا کرنے میں پورا دخل ہے بلکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ خالص دعاء کے ذریعہ سے اسباب ضروریہ ایسے طور پر مہیا ہو جایا کرتے ہیں کہ عاجز بندہ کے خیال میں ان کا ان حالات میں پیدا ہونا بالکل غیر متوقع تھا چونکہ فطرت انسانی کو اپنے خالق سے ایک ایسا مخفی تعلق ہے جس کی حقیقت سے عوام الناس آگاہ نہیں ہو سکتے اور اسی تعلق کے مقتضاء پر دعاء کا اثر ظاہر ہوتا ہے اس لئے غایت جہالت کی وجہ سے دعاء کی ضرورت اور تاثیر کا انکار کرنے لگ گئے مگر اس انکار میں مبتلا ہونے والے اکثر وہ جہال فلاسفہ ہیں جو ملحدین نیاچرہ کہلاتے ہیں ہم ذیل میں اس مفسدہ گروہ کے خیالات کو باطل ثابت کرتے ہیں جب ہم از روئے کتاب و سنت اس امر پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارا ایک ایسا خالق ہے جو تمام صفات کاملہ سے موصوف ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے آزاد ارادہ سے کرتا ہے اور وہ فعل عین مصلحت ہوتا ہے اس لئے ہماری آسانی کے لئے ہماری ضرورتوں کے موافق سلسلہ اسباب قائم کر کے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی ہے چونکہ وہ سمیع و بصیر ہے اس لئے وہ ہر ایک کی پکار کو سنتا اور اس کے حالات کو دیکھتا ہے یہ امر ہماری فطرت کا اقتضاء ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں پر اسباب مناسبہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی امر کے لئے اسباب نہیں اور ہم عاجز آجاتے ہیں تو مجبوراً اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چونکہ وہ ہماری حالت کو دیکھتا ہے اور اس کو ہماری ضرورت کا علم ہے اور وہ ہماری پکار کو سنتا ہے اور رحمت کا نازل کرنا اس کی ذاتی وصف ہے لہذا جب ہم خارجی اسباب سے قطع تعلق کر کے اس کو موثر حقیقی یقین کرتے ہیں اور تمام سلسلہ اسباب کو اس کی مشیت کا مقہور و مغلوب جانتے ہیں۔ تو اس کی ارادت ہماری ضرورت کے مطابق حرکت کر کے ملائکہ رحمت کو اسباب مناسبہ کی فراہمی کا حکم دیتی ہے ہم ان اسباب کی طرف

رجوع کر کے فائز بالمرام ہوتے ہیں۔

حقیقت استجابت دعا

اور یہی استجابت دعاء کی حقیقت ہے مگر حق یہ ہے کہ جب مرکز عبودیت پر آدمی اپنے پاؤں جما لیتا ہے اور اس کو اپنے ضعف و عجز کا کامل یقین ہو جاتا ہے اور ظاہر و باطن میں منکسر ہو کر حضرت رب العزت کی بارگاہ میں جھک پڑتا ہے۔ تو ایسی حالت میں رحمت الٰہی جوش میں آکر بندہ کو انواع و اقسام کے انعامات و کرامات کا مورد بنا دیتی ہے اور اس عجز و احتیاج کی اس بارگاہ ذوالجلال میں وہ قدر و قیمت ہے کہ سالہا سال کی عبادت ایک وقت کی اس کیفیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر جن شورہ پشتوں کا مذاق استدلال فلسفی نے بگاڑ دیا ہے اور بجز مادہ پرستی کے کسی حقیقت کا انہیں علم نہیں وہ نہ تو اس کیفیت کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ انہیں اس پر ایمان ہے بلکہ ایسے حقائق ان کے نزدیک محض ایک افسانہ ہیں۔

قطع نظر اس امر سے کہ حقیقت دعاء کی تصدیق پر ہماری فطرت شاہد ہے کتاب اللہ اور سنت صحیحہ نہایت زور کے ساتھ دعاء کی طرف بندوں کو بلاتی ہیں کتاب اللہ اور سنت میں ادعیہ ماثورہ کا وجود ہی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ بجز دعاء انسان کو کوئی چارہ نہیں اور صرف دعاء ہی سے انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب پا سکتا ہے یہ بات صرف مذہب اسلام ہی سے خاص نہیں بلکہ تمام مذاہب عالم کا جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں یہ عقیدہ ہے مع ھذا ایک عام فطرت انسانی کا اس کی تائید میں ہونا قطعی حجت ہے ہم قرآن شریف سے چند ایک آیات کو ذیل میں نقل کر کے دکھاتے ہیں کہ دعاء مذہب اسلام میں کس قدر ضروری چیز ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ دعا ہی مذہب اسلام کا اعلیٰ مقصد ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ

دَعْوَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اس آیت میں نہایت صاف طور پر ارشاد ہوا ہے کہ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں اور پھر فرمایا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اس آیت میں صریح طور پر حکم ہے کہ میری بارگاہ کبریاء میں خشوع، خضوع کیساتھ رجوع کرو اور دوسری جگہ اس کو یوں واضح کیا وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کی مہربانی کا سوال کیا کرو اور آیت اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ سے اس امر کا پتہ لگتا ہے کہ اضطرار یعنی بیچارگی کی حالت موجب اجابت ہے اور بے چارگی کو تضرع اور خشوع و خضوع لازم ہے۔ کیونکہ جس شخص کو اسباب سعی حاصل ہوں وہ نہ تو اپنے تئیں بیچارہ جانتا ہے۔ اور نہ اس میں خشوع و خضوع پیدا ہو سکتے ہیں۔

آیات قرآنیہ سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔ بلکہ بعض آیات سے یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا نہ کرنے پر ناراض ہوتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ فَلَوْلَا اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ الایۃ اس آیت کا اسلوب بیان ظاہر کرتا ہے کہ نزول عذاب پر تضرع نہ کرنا موجب غضب ہے۔ اور قساوت قلبی کو دور کرنا اور اس کی جگہ خشوع و خضوع کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ کو منظور ہے۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا نہ کرنے پر ناراض ہوتا ہے اور آداب دعا میں مروی ہے کہ دعا کرتے وقت بندہ کو اجابت کا یقین ہونا چاہیے۔ اور وساوس و شکوک کو دل سے اٹھاوے۔ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے لا ینبغی لا حدکم ان یقول اغفرلی ان شئت ولکن یلجزم المسئلۃ فیقول اللھم اغفرلی یعنی کسی شخص کو نہیں چاہیے کہ دعا کے وقت یوں کہے کہ خدایا اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے بلکہ حرف شرط سے جو شک کے لئے ہے اپنے سوال کو خالی کر کے یقین کے ساتھ یوں سوال کرے کہ خدایا مجھے بخش دے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الدعا مخ العبادۃ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے پھر فرمایا الدعاء ھی العبادۃ یعنی دعا عبادت ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا بجز

عبادت کے اور کچھ نہیں اور بڑا حصہ عبادت کا دعا میں منحصر ہے۔ دعا بجائے خود ایک عبادت ہے جس میں عبودیت کا بروجہ کامل اظہار ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دیگر انواع عبادت سے ممتاز ہے کیونکہ عبودیت عجز و انکسار کی مقتضی اور ربوبیت کبریاء و جبروت کو چاہتی ہے لہذا جب بندہ غایت تذلل کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی غایت عظمت و جبروت کا تصور کرتا ہے تو اس کو بارگاہ مولیٰ میں ایک خاص قرب حاصل ہوتا ہے اور اس حالت قرب میں وہ ایک قسم کی تسکین اور اطمینان محسوس کرتا ہے اور یہ تسکین اور اطمینان علامت اجابت ہے۔ اگر حالت تضرع آنسو بھی جاری ہو جائیں تو یقین سمجھو کہ دعا ہرگز رد نہیں ہو گی۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ قبول دعا کی یہی ایک صورت نہیں کہ مطلوب حاصل ہو جائے بلکہ اگر عطائے مطلوب داعی کے حق میں مناسب ہو تو اسے مطلوب دیا جاتا ہے ورنہ اس کے عوض میں کوئی اور بھلائی اس کو دی جاتی ہے یا کوئی آنے والی مصیبت ٹل جاتی ہے اور اگر ان سب صورتوں سے کوئی صورت نہ ہو تو داعی کے نامہ اعمال میں بطور حسنات کے ذخیرہ رکھی جاتی ہے۔ بہر صورت یہ خیال باطل ہے کہ بعض وقت دعا مقبول نہیں ہوتی ہاں یہ صحیح ہے کہ دعا کسی خاص مطلوبہ صورت میں مقبول نہ ہو مگر ضائع نہیں جاتی کیونکہ وہ بندہ کا ایک عمل ہے اور عمل خواہ کچھ ہی ہو کبھی اکارت نہیں جاتا ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا کو رد نہیں کرتا کہ وہ اکتا کر یوں کہنے لگتا ہے کہ میں نے بہت دعا کی مگر مقبول نہیں ہوئی۔ بندہ کو اکتانا نہیں چاہیے ممکن ہے کہ التواء میں کچھ مصلحت ہو۔ جس کا انکشاف سردست داعی پر نہیں ہوا۔ مگر بعد میں منکشف ہو جائے اس امر کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ گو بلحاظ ظاہری اور باطنی حالات کے دعا کے لئے چند ایک شرائط اور لوازم ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس باب میں جو تضرع اور زاری کو دخل ہے اور کسی چیز کو نہیں قال اللہ تعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً کسی صاحب دل نے کیا عمدہ کہا ہے۔

سرنوشت واژگوں را راست گرداند نیاز
نقش معکوس نگیں از سجدہ ے گردد درست

تضرع اور ابتہال تمام مشکلات پر پانی پھر دیتے ہیں۔ کما قیل

دلا بسوز کہ سوز تو کارہا بکند
دعائے نیم شبی دفع صد بلا بکند

قال المولوی المعنوی

ایکہ خواہی از بلا جان و اخری
جان خودرا در تضرع آوری
کایں تضرع رابر حق قدرہاست
واں بہا کا نجاست زاری را کجاست

بہر صورت دعا کا منجملہ اسباب موثرہ کے شمار ہونا انسانی فطرت میں داخل ہے اور تمام کتب سماویہ اس کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ اور جس بے دین نے اس کا انکار کیا ہے اس نے در حقیقت قرآن مجید کا انکار کیا ہے۔ کما قال بعض المفسرین من طعن فی الدعا فقد طعن فی القرآن وابطلہ یہ خیال کہ دعا سے صرف ایک قسم کی تسلی مقصود ہوتی ہے۔ ورنہ اس کی کچھ تاثیر نہیں کیونکہ امور اپنے اسباب سے وابستہ ہیں۔ انہیں کے موجود ہونے پر وہ امور واقع ہوں گے۔ اس الحاد کا نتیجہ ہے کہ روحانی اسباب کی تاثیر سے قطع نظر کر لیا گیا ہے۔ انکار دعا کو پہلے پہل سید احمد خان علی گڑھی نے رواج دیا۔ بعد ازاں اس کے متبعین نیا چرہ نے گاہ بگاہ اس کے خیال فاسد کی تائید کی۔ اس انکار کے متعلق مفصلہ ذیل اعتراض سنے جاتے ہیں۔

(ا) اگر مطلوب کا ارادہ الٰہی میں واقعہ ہونا ضروری قرار پا چکا ہے تو دعا کرنا بے سود ہے۔ وہ خود بخود وقوع میں آرہے گا اور اگر اس کا وقوع ضروری نہیں تو پھر بھی دعا کچھ مفید نہیں۔ الغرض ہر دو صورت میں دعا ایک امر زائد ہے۔

(ب) جب اللہ تعالیٰ کی صفت یہ ہے کہ وہ علیم بذات الصدور ہے تو پھر دعا کی کیا ضرورت ہے بلکہ ترک دعا اولے ہے۔

(ج) ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین یعنی جو شخص عرض حاجت کو چھوڑ کر میری یاد میں لگا رہتا ہے میں اسے عرض حاجت کرنے والوں سے بڑھ کر دیتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ترک دعا اولے ہے۔

اس قسم کے اور بھی بعض اعتراضات کج فہم لوگ کیا کرتے ہیں مگر در حقیقت ناواقفی کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ کسی امر کے ارادہ ذات باری میں مقدر یا اس کے علم میں ہونے کی وجہ سے ترک اسباب لازم نہیں آتا کیونکہ ممکن ہے کہ ارادہ الٰہی میں بذریعہ دعا ہی وقوع میں آنا مقدر ہو تعجب ہے کہ دعا کی ضرورت پر تو ایسے ایسے فضول اعتراض کئے جاتے ہیں مگر کسی عزیز کے بیمار ہونے پر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اگر اس کے لئے صحت کا ہونا مقدر ہے تو بلا معالجہ حاصل ہو رہے گی اور جو حصول صحت مقدر نہیں تو معالجہ بے سود ہے۔ جو لوگ سلسلہ سبب و مسبب کی حقیقت اور اس کی ضرورت سے آگاہ ہیں وہ کبھی اس خیال باطل پر دعا کو ترک نہیں کر دیتے اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت ایسے مصالح خفیہ کے ساتھ جاری ہے کہ انسان عاجز اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس صورت میں جاری ہو گی؟ لہذا ہم پابندی اسباب سے جو طبعی امر ہے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔

تیسرے سوال کے متعلق اس امر کو دیکھنا ہے کہ آیا یہ حکم ہر حالت کے لئے ہے یا کسی خاص حالت سے مخصوص ہے الفاظ حدیث میں ذکر الٰہی اور سوال کا مقابلہ ہے اور اس میں ایک نفیس اور لطیف راز ہے اور وہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی میں ایثار ہے یعنی اپنی حاجت کو چھوڑ کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ثناء اور عظمت کا اظہار اور سوال عرض حاجت کو کہتے ہیں جو ایک ذاتی غرض ہے لہذا ذکر کرنے والے کو عرض حاجت کرنے والے پر ترجیح ہے اور چونکہ مقام محبت ترک

خواہش سے حاصل ہوتا ہے اس لئے ذاکر مقام محبت میں ہوگا اور دعا کرنے والا مقام ریاضت نفس میں ظاہر ہے کہ مقام محبت مقام ریاضت سے بالاتر ہے لہذا کوئی شخص مورد محبت بن کر جس انعام کا مستحق ہو سکتا ہے دوسری طرف اس کا مستحق نہیں ہو سکتا اب حدیث کے معنی صاف ہو گئے کہ جو شخص ذکر کو اختیار کر کے ترک دعا کرتا ہے وہ دعا کرنے والوں سے زیادہ انعام کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ ذاکر مقام محبت میں ہوتا ہے اور سائل مقام ریاضت میں پس معلوم ہوا کہ حدیث مسطورہ بالا کا یہ مطلب نہیں کہ دعا کرنا بے سود ہے یا دعا کرنا مناسب نہیں بلکہ حضرت رب العزت نے ہر دو شخص کے مقام کا پتہ دیا ہے اور بتلایا ہے۔ ذاکرین سائلین سے زیادہ انعام پاتے ہیں۔

تنبیہ

واضح ہو کہ عوام الناس کے نزدیک سوال الفاظ سے مخصوص ہے یعنی بذریعہ الفاظ عرض حاجت کرنا مگر محققین کے نزدیک کسی شخص کا مضطرانہ حالت میں دل سے متوجہ الی اللہ ہونا ہی سوال ہے بلکہ کسی خاص حالت اضطرار کا اقتضا بلا توجہ بھی سوال ہے۔ آیت وَاٰتَاکُمْ مِنْ کُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْہُ میں لفظ سوال کے مفہوم میں انسان کے مقتضیات فطرت داخل ہیں اور اتاکم کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا سلسلہ ایثار کو ایک خاص مناسبت اور ترتیب سے پیدا کر کے انسان کو ان کی طرف متوجہ کرنا بھی داخل ہے۔ فاحفظ فانہ لطیف

چونکہ دعا کا جزو اعظم وہ اسماء و صفات ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و رحمت پر دلالت کرتے ہیں اور انہی اسماء و صفات کے ساتھ اس مالک حقیقی کو پکارنا چاہیے اس لئے ان کے علیحدہ علیحدہ معانی اور ان کے باہمی امتیاز کو خوب سمجھنا چاہیے تاکہ بوقت دعا ان کا تصور رہے کیونکہ خشوع و خضوع میں اس امر کو بڑا دخل ہے۔

الاسم الاعظم

اس مسئلہ پر بحث کرنا بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ علماء نے اس اسم شریف کی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسم اعظم کوئی خاص معین اسم نہیں بلکہ ہر ایک اسم جس کا کوئی شخص ایسی حالت میں ذکر کرے جبکہ اس کی قوت فکریہ ماسوی اللہ سے منقطع ہو کر صرف ذات باری کی معرفت میں مستغرق ہو جائے اس ذاکر کے لئے اسم اعظم ہے اس دعوی پر وہ چند ایک استدلال پیش کرتے ہیں۔

اول یہ کہ اسم ایک کلمہ ہے جو مخصوص حروف سے مرکب ہوتا ہے۔ جس سے مسمی کا پتہ لگتا ہے اور اسم فی حد ذاتہ شریف نہیں ہو سکتا البتہ مسمی کی شرافت کے رو سے اسے بھی شریف کہہ سکتے ہیں اس لئے جب کوئی شخص کسی اسم سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے تو چونکہ تمام اسماء کا مصداق ذات واحد ہے لہذا وہی اسم اس کے حق میں اسم اعظم ہوگا کیونکہ صرف ذات اقدس کے اعظم و اکمل ہونے سے اس اسم کو بھی اعظم کہہ سکتے ہیں ورنہ تمام اسماء حروف سے مرکب ہونے میں برابر ہیں۔

دوم یہ کہ ذات باری واحد حقیقی ہے اس کے خارجی اور عقلی اجزاء نہیں ہو سکتے لہذا اس کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں کہ بعض اسماء اس کی ذات کے جزو اشرف پر دلالت کرتے ہیں اور بعض کسی دیگر جزو اشرف پر اور جب یہ امر محال ہے تو تمام اسماء اس ذات واحد کامل پر یکساں طور پر دلالت کریں گے لہذا کوئی اسم کسی دوسرے اسم کی نسبت اعظم نہیں کہلا سکتا۔

سوم یہ کہ بعض آثار صحیحہ میں بھی مذکورہ بالا رائے کی تائید موجود ہے مثلاً حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کسی نے اسم اعظم کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے اسے کہا کہ اٹھو اس حوض میں غسل کرو۔ بعد ازاں تم اسم اعظم مجھ سے سیکھو۔ وہ شخص حوض میں داخل ہو کر غسل کرنے لگا۔ موسم زمستان تھا اور پانی

یخ بستہ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت جلد باہر نکلنا چاہا۔ امام ممدوح نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے باہر مت آنے دو۔ وہ شخص باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا۔ مگر وہ لوگ اسے پھر پانی میں دھکیل دیتے اس نے بہت منت سماجت کی۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ آخر اسے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں تب اس نے نہایت یاس اور غایت زاری کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی رہائی کی التجا کی۔ ان لوگوں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے فی الفور اسے باہر نکال لیا۔ اور کپڑے پہنائے کچھ دیر بعد جب اس میں کچھ طاقت آگئی تو امام صاحب سے عرض کیا کہ اب تو اسم اعظم سکھلایئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے تو اسم اعظم سیکھ لیا ہے اور وہ وہی اسم تھا جس کے ساتھ تو نے اپنے مولی کو پکارا تھا۔ اور اس نے تیری التجا کو منظور کیا اس نے پوچھا وہ کیسے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ اسماء ذات باری میں سے ہر ایک اسم غایت عظمت و جلالت رکھتا ہے اور انسان جب کسی اسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو چونکہ دل سے اس کو تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف زبان پر لفظ جاری ہوتا ہے اس لئے اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا مگر جب اسی اسم کے ساتھ غایت میں اور اضطرار کی حالت میں غیر اللہ سے الگ تھلگ ہو کر پکارتا ہے تو وہی اسم اسم اعظم ہو جاتا ہے تمہیں جب غیر اللہ کی طرف سے ناامیدی ہو چکی تھی تو اسباب سے قطع تعلق ہو گیا تھا اور صرف اس مالک حقیقی کی رحمت پر توجہ محدود ہو گئی تھی لہذا جس اسم کے ساتھ تم نے اسے پکارا وہی اسم اعظم ہو گیا۔

اسی طرح مروی ہے کہ ایک شخص ابو یزید بسطامیؒ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے اسم اعظم کا پتہ دیجئے انہوں نے فرمایا کہ اسم اعظم کے لئے کوئی خاص حد معین نہیں اپنے قلب کو غیر اللہ سے پاک و صاف کر کے صرف اسی ذات مقدس کی طرف رجوع کرو۔ پھر جس اسم سے تم اسے پکارو گے وہی اسم اعظم ہو گا۔ غیر اللہ سے الگ تھلگ ہو کر ذات باری کو پکارنا اور ایسے وقت میں اسے جس اسم سے پکارا جائے اس کے ذریعہ دعا کا مقبول ہونا پایہ یقین کو پہنچ چکا ہے

اور اس میں راز صرف یہی ہے کہ جس قدر غیر اللہ سے قطع تعلق ہو جاتا ہے اسی قدر قلب کا تعلق ذات باری کے ساتھ بڑھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اسم ایسی حالت میں بطور اتم موثر ثابت ہوتا ہے اسی خیال پر ایک محقق نے لکھا ہے کہ پورے طور پر انسان صرف اس وقت غیر اللہ سے الگ تھلگ ہوتا ہے جبکہ وہ نزع کی حالت میں ہوتا ہے اس حالت میں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی شخص کی طرف سے اس کے دل میں خوف و رجا باقی نہیں رہ جاتے اس لئے ایسی حالت میں عاجز بندہ جس اسم کے ساتھ حضرت رب العزت کو پکارتا ہے وہ اس کے حق میں اسم اعظم ہو گا اور اس اسم کا مقتضے یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم بندہ کے شامل حال ہو گا یعنی اس کو درکات عذاب سے رہائی دے کر درجات ثواب تک پہنچا دے گا اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ جناب نبوی کا فرمان مبارک من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ مذکور بالا حکمت پر مبنی ہے فصلی اللہ علیہ وسلم

علماء کا ایک دوسرا گروہ ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم ایک خاص معین اسم ہے۔ پھر یہ لوگ بھی دو قسم کے ہیں ایک تو قائل ہیں کہ بندوں کو اس کا علم ہے دوسرے قائل ہیں کہ کسی کو اس اسم کا علم نہیں ہر ایک گروہ اپنے اپنے دلائل پیش کر کے اپنے دعوی کو ثابت کرتا ہے جو لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ بندہ کو اس کا علم ہے۔ ان میں اختلاف ہے کہ وہ کونسا اسم ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ وہ اسم ھو (علمائے حدیث میں سے شیخ ابن تیمیہ اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ ھو اسم ذات باری ہے چہ جائیکہ وہ اسم اعظم ہو) اور مقام دعا میں یا ھو یا من لا ھو الا ھو یا من بہ ھویۃ کل ھو بولا کرتے ہیں مفصلہ ذیل دلائل کے رو سے یہ اسم اسم اعظم ہے۔

اول یہ کہ اسم ھو کنایہ ہے ذات واحد سے جو بطور غیبت اور فردانیت کے موجود ہے غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات تمام اشیاء سے علیحدہ ہے۔ یعنی وہ نہ کسی چیز میں نہ کسی چیز کے اوپر نہ کسی چیز سے متصل اور منفصل ہے اور

فردانیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر ایک جہت سے فرد مطلق ہے اور تمام صفات میں کامل و مکمل ہے لہذا اسم ھو کا اطلاق ذات باری پر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ وہ ان تمام صفات سے موصوف ہے جو اس کے شایان شان ہیں۔ لہذا اسم ھو اخص الاسماء قرار دیا گیا۔

دوم یہ کہ موجودات کا ایک خالق حقیقی کی طرف محتاج ہونا ایک ایسا واضح اور بین امر ہے کہ اس کے متعلق کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ایک امر فطری ہے یہی وجہ ہے کہ مشرکین اس سوال کے جواب میں کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے بجز ذات باری کے کسی غیر کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اسم ھو سے ایک ایسے موجود حقیقی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جس کی ضرورت پر انسانی فطرت شاہد ہے اور یہ اسم اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ موجودہ حقیقی اپنی ماہیت ذات کی جہت سے باطن (مخفی) ہے اور بلحاظ دلائل کے ظاہر اس لئے یہ اسم اسم اعظم ہے۔

سوم یہ کہ عموماً قاعدہ ہے کہ سلاطین عظیم الشان کو اگرچہ متکلم سامنے موجودہ ہو بجائے صیغہ خطاب کے صیغہ غائب سے تعبیر کیا کرتے ہیں یعنی بجائے انت فعلت کذا کے ھو فعل کذا بولا کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ھو اعظم الکنایات قرار دیا گیا ہے۔

بعض دیگر کا خیال ہے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے اور وہ اس کے متعلق چند وجوہ بیان کرتے ہیں اولاً اس اسم کا اطلاق بجز ذات باری کے کسی اور چیز پر نہیں کیا گیا کیونکہ اہل عرب اپنے معبودوں کو الھۃ کہا کرتے اور یہ اسم مبارک صرف ذات واحد سے مخصوص تھا۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اور پھر فرمایا هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا یعنی کوئی مخلوق ذات باری کا ہمنام نہیں کیونکہ وہ اسم اللہ سے موسوم ہے جو کسی غیر پر اطلاق نہیں پا سکتا چونکہ اس اسم کو ذات باری سے خصوصیت ہے اس لئے

اشرف الاسماء ہے۔

ثانیاً اسم اللہ دیگر اسماء ذات باری کی نسبت اصل ہے یعنی تمام دیگر اسماء کو اس اسم کی طرف مضاف کیا کرتے ہیں اور اسے مضاف الیہ قرار دیتے ہیں مثلاً یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ رحیم، رحمٰن وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں یوں نہیں کہا کرتے کہ بسم اللہ الرحمان الرحیم (سورۃ ابراہیم کی ایۃ الی صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ میں یا تو تقدیم و تاخیر ہے یعنی اِلٰى صِرَاطِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِيْ یا بموجب قرات نافع و ابن عامر لفظ اللہ مرفوع مبتدا ہے اور الذی مع صلہ خبر مبتدا فلا اشکال) کا اسم ہے۔

ثالثاً آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر دو اسم بہ نسبت دیگر اسماء کے مخصوص ہیں اور ان ہر دو میں سے اسم اللہ اسم رحمان پر مقدم ہے اس لئے کہ اسم اللہ جامع جلال و جمال ہے اور اسم رحمان صرف جہت جمال پر مشتمل ہے لہذا اسم اللہ اشرف ہے رابعاً کافر کا اسلام لا الہ الا اللہ کہنے پر معتبر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کسی دیگر اسم سے اظہار کرے تو نہیں اور یہ امر بھی اسم اللہ کے اشرف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

(خامساً) آیۃ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اللہ دیگر اسماء کی نسبت اشرف ہے کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کو تمام غیر اللہ سے منقطع ہو جانے کی ہدایت کی ہے اور اسم اللہ کے ساتھ ذات باری کی توحید کامل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا یہ اسم اشرف الاسماء ہے۔

(سادساً) کتاب اللہ شریف کو پہلے اسم اللہ سے شروع کیا گیا ہے اور یہ بھی دلیل اس کے اشرف الاسماء ہونے کی ہے بعض علماء نے اس اسم کے اشرف الاسماء ہونے پر اور بھی دلائل قائم کئے ہیں ہم نے نظر باختصار انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

علماء کا ایک تیسرا گروہ ہے۔ جو الحی القیوم کو اسم اعظم قرار دیتا

ہے اور اس کے متعلق دو وجوہ بیان کرتے ہیں اول یہ کہ بروایت ابی بن کعبؓ مروی ہے کہ انہوں نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسم اعظم کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ اسم اعظم ان ہر دو آیات میں ہے۔ (ا) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (ب) الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ مگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اسم اعظم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دیگر آیات میں بھی موجود ہے۔ اس لئے الحی القیوم ہی اسم اعظم ہے۔

اور ایک روایت میں جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسم اعظم الحی القیوم ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ اسم صرف تین آیات میں مذکور ہے دو تو مسطورہ بالا آیات ہیں اور تیسری آیت ہے وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ دوم یہ کہ ان ہر دو اسم کے مفہوم میں تمام دیگر صفات کاملہ کا مفہوم داخل ہے یعنی ان اسماء کے ذکر کرنے پر دیگر صفات کے علیحدہ ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی لہذا یہ ہر دو اسم اعظم الاسماء ہیں۔

علماء کا ایک چوتھا گروہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اسم اعظم ہے اولاً اس لئے کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے الظوابیا ذالجلال والا کرام یعنی ذوالجلال والا کرام پر جم جاؤ اور اس اسم کے ذکر کو لازم پکڑو یہی وجہ ہے کہ اکثر ادعیہ ماثورہ میں یہ اسم وارد ہوا ہے۔ (ثانیاً) یہ اسم تمام دیگر صفات الٰہیہ پر مشتمل ہے کیونکہ اس میں ہر دو قسم کے صفات جلال و جمال کا مفہوم داخل ہے۔ (اکرام صفات جمال کی طرف اشارہ ہے) علماء کا ایک پانچواں گروہ ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم حروف مقطعات قرآنیہ میں مذکور ہے چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آپ کسی مشکل کے موقع پر یوں دعا کیا کرتے یا کھیعص یا حم عسق اسی طرح سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حروف مقطعات کی دو صورتیں ہیں ایک تو ایسے حروف ہیں جن کی ترکیب سے کوئی اسم مرکب ہو سکتا ہے۔ مثلاً الرہ حم ہ ن کی ترکیب سے اسم الرحمان کی ترکیب ہو سکتی ہے دوم وہ حروف ہیں جن سے کوئی

ایسی ترکیب حاصل نہیں ہو سکتی اور اسم اعظم انہیں حروف میں محدود ہے ایک اور روایت میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کی بابت سوال کیا جس سے کہ دعا مقبول ہو جاتی ہے تو مجھے ایک رویاء میں بتلایا گیا کہ دعا میں یوں کہا کرو۔ اللھم انی اسئلك الله الله الذی لا اله الا هو رب العرش العظیم امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان الفاظ میں جب دعا کی مقبول ہوئی۔

یہاں تک ان مذاہب کا بیان تھا جن میں یہ مذکور ہے کہ اسم اعظم مخلوق کو معلوم ہے دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم کا علم کسی کو نہیں اور اس کے مخفی رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ طالب جمیع اسماء حسنے کا ذکر کرے اور اس کی مثال بعینہ لیلۃ القدر کی سی ہے۔

خاتمۃ الکتاب

واضح ہو کہ بعض اکابر مشائخ رضی اللہ عنہم کی زبان پر خاص خاص حالات میں ایسے کلمات بھی جاری ہوئے ہیں۔ جو بظاہر نصوص آیات و احادیث کے مخالف معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر علمائے اسلام نے بلا تاویل ایسے کلمات کہنے والے کی تکفیر کر دی ہے۔ مگر بعض محتاط حضرات نے توسع اور استعارہ پر نظر کر کے ایسے کلمات کا کوئی محمل صحیح قرار دیا ہے اور تکفیر سے اجتناب کیا ہے اور یہی مسلک اصوب و اسلم بھی ہے کیونکہ جب ہمیں قطعاً علم ہے کہ قائل متبع کتاب و سنت اور صحیح العلم والعمل ہے تو صرف ایک ایسے جملہ سے جس میں توسع و استعارہ کو بہت وسیع دخل ہے ہم کیونکر تکفیر کر سکتے ہیں جو اصحاب حضرات مشائخ کے کلام میں اشارات و تلویحات اور تشبیہات و استعارات اور تمثیلات و کنایات کی حقیقت سے واقف ہیں وہ یقیناً ایسے جملوں کو جو بظاہر مخالف شریعت معلوم ہوتے ہیں ہرگز موجب زندقہ و الحاد قرار نہیں دیتے وجہ اس کی یہ ہے کہ سالک پر ہر ایک مقام ترقی میں ایسے معارف و اسرار

کا انکشاف ہوتا ہے جو کسی پہلے نچلے مقام سے کہیں زیادہ دقیق و عمیق ہوتے ہیں اس لئے کوئی الفاظ ایسے نہیں جو ان حقائق کو اصلی صورت میں ظاہر کر سکیں لا محالہ ان کیفیات یا حقائق کے اظہار کے لئے مجازات و کنایات کی ضرورت پڑتی ہے اور بسا اوقات تشبیہ و تمثیل سے کام لیا جاتا ہے کوتاہ فہم اور ناقص الادراک لوگ ذوق معانی سے بے بہرہ ہوتے ہیں حقیقت اصلیہ پر نہ آگاہ ہو کر حضرات مشائخ کے بارے میں زبان طعن کھول دیتے ہیں مگر خاکسار مولف عرض کرتا ہے کہ بمقتضائے

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نہ دلبرا خطاء اینجا است

جب تک کوئی شخص خود صاحب مقام نہ ہو اسے نہ تو تصدیق کرنا چاہیے اور نہ تکذیب نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم اپنی کتاب فتاوی دلیل الطالب کے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ امام شوکانی نے اپنے ایک رسالہ میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کی تکفیر کر کے چالیس سال کے بعد رجوع کیا اور یہ لکھا کہ میں نے فتوحات مکیہ میں غور کر کے شیخ اکبر کے کلام کا محمل صحیح بطریق تاویل سمجھ لیا اور اب میں اپنی سابقہ تحریر سے توبہ کرتا ہوں چنانچہ وہ عبارت حسب ذیل ہے (یقول مولف هذه الرسالة غفرالله له هو تائب الى الله من جميع ماحرره فيها ممالا يرضى الله عزوجل وقد طالعت بعد تاليفها الفتوحات والفصوص فرأيت ماللتاويل فيه مدخل لاسيما عند هولاء الذين هم خلاصة الخلاصة من عباد الله عزوجل و كان تحرير هذا بعد تحرير الرسالة بزيادة على اربعين سنة) اور کچھ شک نہیں کہ معارف و حقائق کے لئے مدارج ہیں جو ہر ایک نااہل کی مجلس میں قابل بیان نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ سید الطائفہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ خاص خاص معارف و حقائق کے بیان کرتے وقت بجز مسترشدین اہل مقام کے دوسروں پر مکان کا دروازہ بند کر دیا کرتے کیونکہ نااہل لوگ تصور

فہم کی وجہ سے فی الفور تکذیب و تکفیر پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے۔ تكلموا الناس على قدر عقولهم یعنی لوگوں سے ان کے مدارج عقول کو ملحوظ رکھ کر خطاب کیا کرو جامع بخاری میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ مروی ہے حدثوا الناس بما يعرفون اتحبون ان يكذب الله ورسوله یعنی لوگوں سے وہ کلام کرو جس کو وہ سمجھ سکیں کیا تم پسند کرو گے کہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ توحید ذات باری اور مبداء و معاد عالم اور عالم ملکوت اور حقیقت روح وغیرہ مسائل دقیقہ و عمیقہ کے متعلق عوام الناس میں ہرگز کوئی بحث نہیں کرنی چاہیے ورنہ بجائے فائدہ کے لوگوں کے اعتقادات میں تزلزل اور فساد عائد ہو گا وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ مادیات اور لوازم مادیات سے بالاتر حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ تعلیم وحی میں بھی اشارات ہی سے کام لیا گیا ہے اگر تصریح ہوتی تو معیار عقائد کا قائم کرنا ناممکن تھا بخاری بروایت مقبری عن ابی ہریرۃ راوی ہیں حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم وعائين فاما احدهما فبثثته واما الاخر فلوبثثته قطع هذا البلعوم یعنی میں نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علم کو ضبط کیا ہے ایک قسم کا اظہار تو میں نے کر دیا ہے اور دوسری قسم کا اگر اظہار کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے اس کے متعلق بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ دوسری قسم سے جو ناقابل اظہار ہے وہ احادیث مراد ہیں جو ان اہل جور وستم کے حالات اور اظہار اسمائے اور مذمت پر مشتمل تھیں جو حضور علیہ السلام کے بعد دین میں فتنہ و فساد کا موجب ہوتے رہے مگر خاکسار مولف عرض کرتا ہے کہ یہ حضرات شارحین کا اپنا قیاس ہے ورنہ صحیح یہ ہے کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ایسے معارف و حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے اخذ کرنے سے عام لوگوں کے افہام قاصر ہیں اور خود امام بخاری کا اس حدیث کو کتاب العلم میں بیان کرنا مذکورہ بالا معارف و حقائق سے مراد لینے پر ایک پختہ قرینہ ہے ورنہ بلحاظ مناسبت مقام

ضروری تھا کہ اس حدیث کو کتاب الفتن میں لکھتے یہاں یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ اگر ہم ظواہر احکام شریعت کے سوا معارف و حقائق باطن کا اقرار کریں تو فرقہ باطنیہ کے مذہب کی تائید ہو گی کیونکہ باطنیہ کے عقائد ایسے باطن پر مبنی ہیں جو ظواہر شریعت کو باطل کرتے ہیں مگر وہ حضرات مشائخ جو کتاب و سنت کے بدوں ایک قدم چلنا بھی حرام جانتے ہیں اور مخالف شریعت کو دشمن خدا اور رسول سمجھتے ہیں باطنیہ ملاحدہ کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے چنانچہ ابن حجر فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں قال المنیر جعل الباطنیة هذا الحدیث ذریعة الی تصحیح باطنهم حیث اعتقدوا ان للشریعة باطنا وظاهراو ذلك الباطن انما حاصله الانحلال من الدین یعنی باطنیہ فرقہ کے لوگوں نے اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور یہ باطن ایسا ہے جس سے شریعت کا تارو پود ہی اڑ جاتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسا باطن جو منافی ظاہر شریعت ہو کفر و الحاد ہے مثلاً باطنیہ کا خیال ہے کہ نماز پنجگانہ سے آئمہ اہل بیت کے پانچ آدمی مراد ہیں اسی طرح وہ تمام احکام کی حقیقت کو باطل کرتے ہیں سو معاذ اللہ کہ اکابر حضرات مشائخ اس قسم کے الحاد کے قائل ہوں دیکھو ابن حجر کے لفظ و ذلك الباطن سے وہی باطن مراد ہے جو منافی شریعت حقہ ہے نہ یہ کہ معارف و حقائق کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہو سکتا جو حضرات مشائخ کو مقام مکاشفہ و مشاہدہ میں حاصل ہوتا ہے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ معارف و اسرار توحید کی اصلیت کا انکار کرنا منشاء شریعت کے منافی ہے کیونکہ حقیقت توحید کے مختلف مقامات ہیں اور انہیں میں عارف کو سیر حاصل ہوتی ہے بھلا باطنیہ ملاحدہ کو اس نعمت بیش بہاء سے کیا تعلق؟ صاحب کتاب نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختار شیخ عبدالجواد شربینی کی کتاب درالاصداف فی مناقب الاشراف سے نقل کرتے ہیں کان علی بن الحسین عاملا علی کتمان اسرار اللّٰه تعالی فی العالم کما اشارالی ذلك فی قوله رضی اللّٰه عنه

یارب جوہر علم لو ابوح به
لقیل لی انت ممن یعبد الوثنا
ولاستحل رجال صالحون دمی
یرون اقبح مایا تونه حسنا

یعنی امام زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہما اسرار توحید کے اخفاء پر عامل رہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "ایسے بہت سے علوم ہیں کہ اگر میں ان کا اظہار کروں تو لوگ مجھے مشرک (بت پرست) کہہ دیں اور حضرات علماء امت میرا خون جائز رکھیں اور بدترین سلوک کو میرے حق میں اچھا سمجھیں" اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے کمیل بن زیاد نخعی کو ایک خطاب میں یوں فرمایا، ها ان ههنالعلما جما (وارشار الی صدره) لواصبت له حملة یعنی سنو! کہ یہاں (میرے سینہ) میں بے پایاں علم ہے کاش! میں کسی کو اس کا اہل پاتا۔ کیا اس علم سے احکام فقہ مراد ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ حضرات صحابہ میں اس علم کے ماہر ہزاروں موجود تھے اور کیا کوئی دوسرے علوم دینویہ مراد ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ علوم بھی آپ سے مخصوص نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان علوم سے اسرار توحید مراد ہیں نہ کچھ اور۔

دیکھو علم مترادف یقین ہے اور قرآن مجید میں یقین کے مدارج مذکور ہیں اور وہ مدارج بہ ترتیب علم الیقین۔ عین الیقین حق الیقین کے الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں ایسا کون بیوقوف ہے جو ان ہر سہ مراتب یقین میں امتیاز نہ کر کے علوم حقہ باطنیہ کا انکار کر دے اور یہ کہہ دے کہ بجز ان علوم شرعیہ کے جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں کوئی اور علوم دائرہ شریعت میں داخل نہیں۔ یقین ایک کیفیت باطنی کا نام ہے پس ازروئے قرآن مجید ثابت ہو گیا کہ علوم شرعیہ کی دو صورتیں ہیں اول وہ جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اور دوم جو باطن سے متعلق ہیں اور ان ہر دو میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے یعنی علوم شرعیہ جو ظاہر سے تعلق

رکھتے ہیں اور ملزوم ہیں علوم باطنیہ لازم۔ اگر ملزوم کا وجود نہ ہو تو لازم خود معدوم ہو گا اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ بدوں پابندی احکام شرعیہ کوئی شخص معارف و حقائق کا مالک نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ اکابر مشائخ رضی اللہ عنہم بالاتفاق اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ جو باطن منافی ظاہر شریعت ہے وہ زندقہ والحاد ہے اور جو طریق سلوک کتاب و سنت سے وابستہ نہیں وہ شیطان کا طریق ہے اور اس خیال کے تمام اکابر سلف نے امت مرحومہ تک تبلیغ کر دی ہے اس لئے اگر کوئی شخص علوم باطن کا انکار کرے تو وہ جاہل و مغرور ہے اور جو شخص ظاہر شریعت کا انکار کر کے باطن کا مدعی ہو وہ ملحد و زندیق ہے ہمیں اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت داعی نہ ہوتی اگر ہم اہل زمانہ میں ایسے لوگوں کو نہ دیکھتے جو یا تو سلسلہ باطن کے منکر ہیں اور اس لئے حضرات مشائخ کی نسبت سوء ظن رکھ کر حصول سعادت سے محروم رہتے ہیں یا ایسے لوگ جو ظاہر شریعت کی پابندی سے دست بردار ہو کر مدعیان معرفت ہیں اور در حقیقت ہر دو گروہ باطل پرست ہیں اور اہل حق صرف وہ ہیں جو پابندی کتاب و سنت مقام مکاشفہ و مشاہدہ تک ترقی کرتے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے وجہ انکار بجز جہالت کے اور کچھ نہیں غلط فہمی سے ان لوگوں کو جو علوم شرعیہ رسمیہ کو پڑھ کر مناظرہ و مجادلہ پر کمربستہ رہتے ہیں معارف و اسرار باطن کا مالک بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور اہل باطن کو خیال باطل مخالفان شریعت تصور کیا جاتا ہے اگرچہ وہ کتاب و سنت سے سر مو مخالفت کو بھی حرام جانتے ہیں مگر چند ایک احادیث کی بناء پر جن کی توجیہ صحیح سے یہ منکرین بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کے فیض صحبت سے مستفیض نہیں ہوتے اور مقولہ لکل فن رجال پر غور نہیں کرتے خضرؑ و موسیٰؑ کا واقعہ اثبات باطن پر کافی دلیل ہے۔ اکثر حضرات مشائخ کرام کے بعض اقوال پر بھی نکتہ چینی کی جاتی ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ اکابر ارباب معرفت اہل رسم اور الفاظ پرست لوگوں کے مطاعن سے محفوظ رہے ہوں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ چونکہ ولایت کبرے مستلزم جمیع کمالات حقہ

ہے کیونکہ اس کے انوار مشکوۃ نبوت سے اقتباس کئے جاتے ہیں اس لئے یہ حضرات محجوبان ظاہر بین کے انکار و تشنیع کا مورد اسی اتباع نبوت میں بنا کرتے ہیں اور متحمل بھی ہوتے ہیں لہذا صحیح طور پر یہی فرقہ عالیہ بارگاہ رب العزت میں عزت و کرامت کے تاج اور ظاہری و باطنی کمالات کے بیش بہا خلعت سے سرفراز ہوتا ہے جو سعادت مندان کے دامان نسبت سے وابستہ ہو گئے منزل مقصود کو پہنچ گئے اور جو خود پرست الفاظ کے جوڑ توڑ میں غلطاں و پیچاں رہ کر سوء ظن کے مقام میں پڑے رہے محروم رہ گئے یہ الٰہی داد ہے کسی کے باوا کی میراث نہیں اور نہ تو وہ در تودہ کتب رسمیہ کے علم پر موقوف ہے اور نہ یہاں بحث و جدل کا کام ہے بلکہ اول قدم اس دشوار گذار راستہ میں وہی اٹھا سکتا ہے جو بحث و جدل کو بالائے طاق رکھ کر حسن ارادت کے مرکب راہوار پر سوار ہو۔

این نعمت بیدلی بہر دل ند ہند
دیں نزل تھکگان منزل ند ہند
در عالم عشق آنچہ بے عقلاں راست
یک ذرہ بصد ہزار عاقل ند ہند

ہاں یہ ضروری ہے کہ طالب ایسے لوگوں کے دام تزویر سے بچتا رہے جو لباس سنت اور پیرایہ شریعت سے عاری ہوں اور جن کے عقائد سلف صالحین کے عقائد کے ساتھ مطابق نہ ہوں کیونکہ ہمارے زمانہ ناہنجار میں بہت سے ہوسناک ایسے نکل آئے ہیں جو بڑے بڑے دعاوی کے ساتھ عوام الناس کو راہ راست سے گمراہ کر رہے ہیں اور سلف صالحین کے طریق سے جن سے بڑھ کر کوئی شخص متبع سنت نہیں ہو سکتا کوسوں دور جا پڑے اس لئے میں اس رسالہ کے ناظرین کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ رجوع الی اللہ کرنے سے پہلے اس ضروری امر کا فیصلہ کر لیں کہ وہ طریق شغل و ذکر جس کے بغیر سلوک کے منازل طے نہیں ہو سکتے کس شخص سے حاصل کر سکیں گے ظواہر احکام شرعیہ کی پابندی میں جو شخص حضرات آئمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کے طریق اجتہاد سے باہر ہو اور

خود آیات و احادیث سے بر خلاف آئمہ مجتہدین کے استنباط کرنے کا مدعی ہو اور قرآن و سنت کے بعد سلف صالحین کے قول و فعل کو اپنا شعار نہ بنائے۔ جان لینا چاہیے کہ اس کی صحبت زہر ہلاہل سے کم مضر نہیں ہوگی کیونکہ مشیت ایزدی کے مطابق جب تک دین میں فتنہ و فساد کا دروازہ نہیں کھلا تھا لوگوں کو بوجہ غایت حق پسندی و سلامت روی کے کسی خاص معیار اجتہاد کی ضرورت نہ تھی اس لئے طالب حق کو اکتساب احکام فقہیہ کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی مگر جب اسلام میں فتنہ و فساد کو دخل ہونے لگا اور عقائد و احکام کی صورت بدلنے لگی تو احادیث نبویہ کی تدوین اور احکام فقہیہ کی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ حضرات اکابر دین کی مساعی جمیلہ سے حدیث و فقہ کی تدوین و ترتیب مکمل ہو گئی اور مسلک شریعت متعین ہو گیا اور تمام مسائل شرعیہ اجتہادات حضرات آئمہ اربعہ کے دائرہ میں محدود ہو گئے اور طالبان حق کے لئے سہولت پیدا ہو گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تک فقہ اسلامی بایں جامعیت و وسعت ہرگز محفوظ نہ رہ سکتی زمانہ انقطاع اجتہاد کے بعد کوئی محدث کوئی فقیہ کوئی شیخ کامل کوئی محقق علوم دینیہ ایسا نہیں گذرا جس نے حضرات ائمہ اربعہ جزاہم اللہ جزاء موفورا کے طریق اجتہاد کا اتباع نہ کیا ہو اب اگر کوئی بوالہوس منہ بنا کر اس کا انکار کرنے لگے تو بجز اس کے کہ وہ اپنی شقاوت کا اظہار کرے اور کیا سمجھا جائے گا ایسے لوگوں کی بات کو ایک آن کے لئے بھی نہیں سننا چاہیے اب رہا مقامات سلوک کو ارباب سلوک سے حاصل کرنا سو اس کے متعلق یوں سمجھنا چاہیے کہ جب تک طریق ذکر مطابق کتاب و سنت کے کسی اہل تقوی سے حاصل نہ کیا جائے مقامات کا طے کرنا ممکن نہیں اور اہل تقوی بجز متبعین حضرات مشائخ کرام کے صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود پایہ اجتہاد رکھنے کے علاوہ صاحب مقام بھی ہو اور اسے کسی صاحب مقام سے نسبت حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور ایسی نسبت کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامان محبت سے وابستہ ہو مگر ایسے لوگوں کا وجود شاذ سمجھا گیا ہے اس لئے اسلم طریق یہ ہے کہ

کسی ایسے عارف صاحب کمال کی تلاش کی جائے جس نے خود کسی طریق معروف اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق مقام استقامت حاصل کیا ہو جس کی شناخت یوں ہو سکتی ہے کہ وہ ضروری علم کتاب و سنت رکھتا ہو اور دائرہ فقہ مجتہدین سے قدم باہر نہ رکھے اور رجوع خلائق کے درپے نہ ہو بلکہ اس سے نفرت رکھتا ہو اور لوگوں سے زر و سیم کو قبول نہ کرے اور اگر کوئی شخص بر طریق سنت ہدایا و تحائف پیش کرے تو اسے فی الفور مستحقین پر صرف کر دے اور مجالس اہل دنیا میں بجز کسی نیت شرعی کے ہرگز داخل نہ ہو اور امراء و مساکین کا امتیاز اس کی مجلس میں ہرگز نہ کیا جائے اور کسی بدعت اعتقادی یا عملی میں مبتلا نہ ہو اگر ایسا شخص مل جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے مگر حق یہ ہے کہ ایسے اصحاب کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں اور اگر ایسا صاحب ارشاد نہ مل سکے تو نوافل و اذکار مسنونہ کو لازم پکڑ لے اور ان میں فروگذاشت نہ کرے کیونکہ پابندی سنت عامل کے قلب کو نور معرفت سے منور کر دیتی ہے مگر اس صورت میں کچھ زیادہ مجاہدت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ سالک کو مقامات توحید کے طے کرنے میں بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جن میں وہ شعور خارجی سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے بلکہ اس سے آگے ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جس میں اس کو اپنی ذات کا شعور بھی نہیں رہتا حتی کہ وہ عدم شعور کے شعور سے بھی بے بہرہ ہو جاتا ہے ایسے حالات میں جبکہ انوار جلال و جبروت اس پر غالب آکر اس کے آثار بشریت کو مضمحل اور ناپدید کرتے ہیں اور مقام مشاہدہ حق میں جمعیت کلی سے متصف ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اس کی زبان پر ایسے کلمات جاری ہونے لگتے ہیں جو عوام الناس کے دلوں میں حلول و اتحاد کا خیال پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ ایسے حضرات حلول و اتحاد ہر دو سے بیزار اور ان کے قائل کی تکفیر کے قائل ہوتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ عبد خواہ کسی مقام تک ترقی کر جائے مگر پھر بھی وہ عبد ہی رہتا ہے کیونکہ ذات ممکن کبھی واجب نہیں ہو سکتی اور نہ واجب کبھی ممکن ہو سکتا ہے

مادیات میں اس کی مثال یوں سمجھو کہ لوہا آگ کے قرب میں آگ کے خواص کو اس حد تک قبول کر لیتا ہے کہ اس میں آگ کے قرب میں آگ کے خواص کو اس حد تک قبول کر لیتا ہے کہ اس میں آگ ہی کے خواص لون' احراق وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں مگر وہ کبھی آگ نہیں ہو سکتا اسی طرح عبد کامل کے لئے عین صفات ذات باری کا حصول محال عقلی ہے ہاں ان صفات کے متناسبہ حالات عبد کو حاصل ہو سکتے ہیں جن پر صرف بطور اشتراک اسمی وہی الفاظ بولے جاتے ہیں جو صفات ذات باری پر مگر ان ہر دو یعنی صفات ذات باری اور صفات عبد کی حقیقت ایک نہیں ہوتی بلکہ ان میں ہر ایک جہت سے امتیاز کلی ہوتا ہے کیونکہ صفات باری قدیم اور ذاتی اور کامل اور صفات عبد حادث اور معلول اور ناقص ہیں عبد ہر ایک صفت کا مظہر ہو کر آثار صفات کا متحمل ہو سکتا ہے مگر وہ عین صفات باری کا حصول ناممکن ہے کیونکہ واجب و ممکن کا ایک ہونا یا واجب کا ممکن میں حلول کرنا یا صفات واجب کا منتقل ہو کر عبد کے صفات قرار پانا بروئے دلائل قطعیہ محال ہے اس لئے معلوم ہوا کہ جو کلمات بعض اکابر کی زبان پر غلبہ سکر کی حالت میں جاری ہوتے ہیں ان کی توجیہ صحیح یہ ہو سکتی ہے کہ وہ حضرات ان کلمات کو حیثیت ذات باری سے ناقل ہونے کے زبان پر لاتے ہیں اور اس نقل سے بجز اس کے اور کوئی بات متصور نہیں ہو سکتی کہ محبوب کے کلمات کو استلذاذاً زبان پر لایا جاتا ہے چنانچہ جملہ سبحانی ما اعظم شانی یا جملہ انا الحق وغیرہ کی صحیح توجیہ یہی ہو سکتی ہے کیونکہ کسی متبع شریعت کی نسبت یہ خیال کبھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ بحالت صحت عقل و حواس اپنے تئیں خدائے خالق السموات والارض کہنے لگ جائے چنانچہ ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ جب مطلع ہوتے کہ بحالت سکر کوئی ایسے کلمات آپ کی زبان پر جاری ہوئے ہیں تو آپ مسترشدین کو کہا کرتے کہ تم لوگوں نے کیوں مجھے نہیں روکا؟ اور بعض اکابر نے ایسے کلمات کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ عارف کامل جب عین شہود کے ساتھ اپنا مقام حقائق کونیہ محسوسہ سے بالاتر دیکھ

پاتا ہے تو بحالت غلبہ سکر اپنے قدس کا اظہار کرتا ہے مگر وہ یہ جانتا ہے کہ قدس ذات باری کہیں اس سے بھی بالاتر ہے جس کے ساتھ اسے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی بہر صورت ایسے کلمات مجاز کی طرف لائے جا سکتے ہیں ورنہ ان کا حقیقت پر محمول کرنا کفر صریح ہے کیونکہ بصورت حقیقت اس عقیدہ اور نصارے کے عقیدہ الوہیت مسیح میں کچھ فرق نہیں رہتا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ قلب عارف جب ہر ایک غیر اللہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ انوار توحید سے منور ہو کر انوار کا حکم حاصل کر لیتا ہے جیسے آگ اور لوہے کی مثال میں اوپر بیان ہوا مگر وہ ہر دو ایک نہیں ہو سکتے دیکھو ایک شاعر اس کو محسوسات خارجیہ میں کیونکر ادا کرتا ہے؟

رق الزجاج و رقت الخمر فتشابها فتشا کل الامر
فکا نما خمر ولا قدح وکانما قدح ولا خمر

(بلور کا پیالہ اور شراب ہر دو ایسے لطیف و نازک ہیں کہ ہر دو میں بوجہ غایت مشابہت امتیاز جاتا رہا سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شراب ہے اور پیالہ کوئی چیز نہیں یا پیالہ ہے شراب کوئی چیز نہیں)

جب مادیات میں یہ تشابہ مروج ہے تو روحانیات جن میں غایت تناسب ہے بدرجہ اولے اس تشابہ کے مستحق ہیں مگر اس تشابہ سے ہر دو کا متحد ہونا لازم نہیں آسکتا۔

پس جب حضرات اکابر کے کلام میں اس قسم کا کوئی جملہ پایا جاوے تو اس کو اس قسم کے مجاز و استعارہ پر محمول کر کے توجیہ صحیح پیدا کرنی چاہیے اور ظن فاسد سے برکنار رہنا اصوب و اسلم ہے اس بحث کو امام غزالی رحمہ اللہ نے مقصد اسنی میں اور شیخ ابن تمیہ نے الجواب الصحیح کی دوسری جلد میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ ابن تمیہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی مجازات بعض آیات قرآنیہ و کلام انبیاء میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ یا مسیح علیہ السلام کا قول من رانی فقد رای ابی یا حدیث من رانی فقدر ای الحق

وغیرہ ذلک بعض اہل معرفت کے کلام میں بھی یہ طریق بیان پایا جاتا ہے مثلاً

ساکن فی القلب یعمرہ لست انساہ فاذکرہ

(یعنی محبوب میرے قلب میں ساکن ہو کر اس کو آباد کرتا ہے میں اسے بھولتا ہی نہیں کہ مجھے یاد کی ضرورت پڑے)

ایک اور عارف کا کلام ہے

اذا سکن الغدیر علی صفاء
وجنب ان یحرکہ • النسیم
بدت فیہ السماء بلا امتراء
کذاک الشمس تبدو والنجوم
کذاک قلوب ارباب التجلی
یری فی صفوھا اللّٰہ العظیم

(یعنی جب تالاب کا پانی صاف ہو اور ہوا کی موجیں بھی اسے حرکت نہ دیتی ہوں تو اس میں آسمان اور ستارے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب عارف کا قلب ماسوی اللہ کے غبار کے تعلق سے پاک ہو جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نظر آتا ہے) کسی اور کا کلام ہے

انا من اھوی ومن اھوی انا

جس کا فارسی ترجمہ یہ ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد زین من دیگرم تو دیگری

بہر صورت مذکورہ بالا امثلہ اور ان کی طرح اور اشعار یا جملے بھی کسی حقیقت پر محمول نہیں ہو سکتے کیونکہ حقیقت پر حمل کرنے کی صورت میں کفر صریح لازم آتا ہے اس لئے جمیع اہل تحقیق کے نزدیک ان کی صحیح توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ غلبہ انوار توحید کی وجہ سے جب آثار بشریت مضمحل ہو کر عارف کی نظر سے ناپید ہو جاتے ہیں اور مقام مشاہدہ میں ماسوائے اللہ سے بالکل تجرد

حاصل ہو جاتا ہے تو بطریق غایت استلذاذ آپنے اس تعلق کو ظاہر کرتے ہیں جو انہیں محبوب حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ جس طرح مادیات میں دو متناسب چیزیں باہمی اتصال سے شکل واحد کے ہو جاتی ہیں تو حقائق مجردہ میں ہر دو کا شکل واحد ہونا کہیں زیادہ متصور ہو سکتا ہے مگر یہ محال ہے کہ ہر دو ایک ہو جائیں یا ایک دوسری میں حلول کر جائے لیکن غیر مادی حقائق مجردہ) کی نوعیت تعلق کو ہم لفظوں میں ہرگز نہیں سمجھ سکتے اس لئے اس عقیدہ صحیحہ کو کہ واجب اور ممکن دو علیحدہ علیحدہ حقیقتوں کا نام ہے ہر حال میں اپنا شعار سمجھنا چاہیے اور جہال متصوفہ کے خیالات باطلہ سے کوسوں دور بھاگنا چاہیے کیونکہ اسلام کو رانہ حسن ظن کی سخت مذمت کرتا ہے بعض مدعیان مقامات میں اہل علم پر یوں طعن و تشنیع کیا کرتے ہیں کہ علماء ظاہر کو یہ پایہ نصیب نہیں کہ وہ مقربان بارگاہ صمدیت کے مقامات کو سمجھ سکیں اس لئے اولیاء کا یہ لوگ انکار کیا کرتے ہیں سو ایسے جہال مرفوع القلم ہیں اور عوام الناس کے لئے موجب فتنہ' کیونکہ مقربان بارگاہ میں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس نے خلاف شریعت کسی عقیدہ کی اشاعت کی ہو کتاب و سنت دو شاہد عدل ہیں سو جو بات ان کے معیار شہادت پر صحیح نہیں اس میں خیر و عافیت نہیں بالآخر میں اپنے مسلمان بھائیوں سے استدعا کرتا ہوں کہ طریق راستی یہ ہے کہ انسان کو کسی امر میں غلو اور اصرار نہیں کرنا چاہیے اگر کسی امر کی نسبت معلوم ہو کہ وہ شریعت حقہ کے نصوص کے برخلاف ہے تو اس کی تکذیب و ابطال ہر ایک مسلمان کا فرض ہونا چاہیے اور اگر کوئی امر مجتہد فیہ ہو تو اس میں دوسرے فریق کی تکذیب کرنا موجب خطر ہے ایسے امور میں صحیح طریق یہ ہے کہ اگر خود بروئے دلائل صحیحہ فیصلہ نہ ہو سکے تو علمائے راسخون فی العلم کے طریق کو اختیار کرنا چاہیے اور بزرگان دین کی جو صاحب مقام ہوں مخالفت کرنے سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ بسا اوقات انسان اپنی کم علمی کی وجہ سے کسی حقیقت کی تکذیب کرنے لگ جاتا ہے کما قیل

وکم من عائب قولاً صحیحا

وافته من الفهم السقیم

ایسے حالات میں اگر تصدیق نہ کر سکے تو تکذیب بھی نہیں چاہیے بلکہ سکوت اختیار کرنا اسلم ہے لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امرا فقط

خاکسار اس موضوع میں کچھ زیادہ بحث کرتا اور بعض دیگر مسائل ضروریہ کو بھی قلمبند کرتا مگر اہل زمانہ سے قبول حق کی توقع نہیں کیونکہ وہ اپنے مسلمات سے علیحدہ ہو کر استماع حق نہیں کر سکتے لہٰذا اسی قدر پر اکتفا مناسب سمجھا گیا۔

من گنگ خواب دیدہ و عالم تمام کر
من عاجزم زگفتن و خلق از شنید نش

وکفی باللّٰه شہیدا' واخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العالمین والصلوٰة علی سید المرسلین وعلی اله واصحابه وازواجه اجمعین فقط

ربیع الاول۔ ۱۳۳۰ ہجری المقدس

ومما قلت مرتجلا فی وصف الکتاب العزیز

رویدعواذلی بعض الملام
فمالی لیس یبرح بالحمام

"او میری ملامت کرنے والیو! اپنی ملامت کو کچھ چھوڑو، کیونکہ میں جس حالت (عشق) میں مبتلا ہوں وہ موت سے بھی دور نہیں ہو گی"

اطعت هولے لذین العیش دهراً
فماعا شرت الا للسام

"میں ایک زمانہ بھر خوش زندگی کے پیچھے مارا مارا پھرا، سو میں نے جو زندگی بسر کی اس کا نتیجہ ملال دیکھا"

وکیف یطیب عیش المرء یوماً
اذا مالم یکن غیظ اللئام

"انسان کو بھلا خوش زندگی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے، جبکہ وہ فرومایہ (اہل دنیا) کے حق میں موجب غیظ نہ بن جائے"

و ذقت حلاوة الاشیاء طراً
فاحلی حلوهامر الفطام

"میں نے تمام اشیاء کی شیرینی کو چکھا، سو سب سے شیریں کو ایسا کڑوا پایا جیسے دودھ چھوڑا ہے بچہ کی تلخ چیز جو ماں پستان پر لگا دیتی ہے"

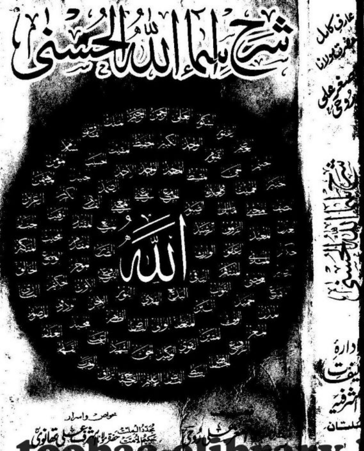
فما استحلیت من دینای شیئاً
سوے ترتیل ایات الامام

"سو میں نے اپنی دنیا سے کسی چیز کو شیریں نہیں پایا، بجز امام یعنی کتاب اللہ کی ترتیل آیات کے"

الذلکل من یبغی فلاحاً
ویرجو الخیر فی دارالسلام

"ہر ایک طالب نجات، اور امیدوار جنت کے لئے سب سے زیادہ لذیذ"

هدی للناس لیس بد خفاء
ولود قد جلا سجف الظلام



صاحب کتاب کا مختصر تعارف

ولادت

۱۸۷۰ء میں گجرات کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔

تعلیم

اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء حضرت مولانا فیض الحسن ادیب سہارنپوری۔ مولانا عبداللہ ٹونکی اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

تدریس

۱۸۹۱ء اسلامیہ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں ریٹائر ہوئے۔

تصانیف

آپ کی تصانیف و تراجم میں الجفاء والوفاء (حافظ ابن قیمؒ) کا اردو ترجمہ کیا۔
امام غزالیؒ کے رسائل حکمت بالغہ اور نعم التعویذ کے اردو تراجم بھی کئے۔
بو علی سینا کی کتاب اشارات کا تجلیات کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ قصیدہ ملت آشوب، حضرت علیؓ کے کلمات طیبات کا اردو ترجمہ کیا۔ مانی الاسلام، سیطرۃ الاسلام، علی الصاری، دیوان روحی فارسی اور دیوان روحی عربی اور شرح اسماء اللہ الحسنیٰ خاص طور پر مشہور ہیں۔

اولاد

اولاد میں ایک دختر اور پانچ فرزند مولانا فضل حق، حافظ عبدالحق، ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی، ڈاکٹر رانا بہاؤ الحق اور رانا مظہر الحق آپ کی یادگار ہیں۔

وفات و تدفین

۱۹۵۳ء میں لاہور میں وصال ہوا اور حسب وصیت آپؒ کو اپنے گاؤں ضلع گجرات میں دفن کیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔